قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝

(البروج)

مذہب کے نام پر

خون

مرزا طاہر احمد

شائع کردہ وقف جدید انجمن احمدیہ ربوہ

انتساب

اُن معصوم رُوحوں کی یاد میں جو اِس دُنیا کی زندگی
میں انسان کے ظلم و استبداد کا
نشانہ بنی رہیں !!!

پیش لفظ

عقائد کا اختلاف تو دنیا میں ہمیشہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا اور انسان اس بارہ میں کُلیّۃً آزاد ہے کہ اپنے دلی یقین کے مطابق جو عقیدہ چاہے اپنائے اور اپنی نجات جن نظریات میں چاہے تصوّر کرے۔ مگر یہ حق کسی کو نہیں دیا جاسکتا کہ اپنے عقائد کو جبراً کسی پر ٹھونسنے کی کوشش کرے یا ایسے عقائد کے مطابق عمل پیرا ہو جو ظلم اور تعدّی کی تعلیم دیتے ہوں۔ یہ طریق جب بھی اختیار کیا جائیگا ہمیشہ ایک لامتناہی فساد کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

اختلافات معقول حد تک دُور کرنے یا سچائیوں کو پھیلانے کا ایک اور صرف ایک طریق ہے کہ امن اور سلامتی کے ماحول میں ہر تعصّب سے پاک ہو کر ایک دوسرے تک اپنے خیالات کو پہنچایا جائے اور ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو دیانتداری کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ جس قدر اختلافات شدید ہونگے

اُسی قدر اس معاملہ میں حلم، بردباری اور متانت کی زیادہ ضرورت ہو گی۔ اور اس بات کی ضرورت ہو گی کہ اشد ترین مخالف کے معاملہ میں بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے اور نظریاتی اختلافات پر سیخ پا ہو کر نعرہ ہائے جنگ بلند کرنے کی عادت ترک کر دی جائے۔

لیکن نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بہت سے دوسرے مشرقی ممالک کی طرح ہمارے ملک میں بھی ایسی پاکیزہ اور پُر امن فضاء کا فقدان ہے۔ اور ایک ایسے کم تربیت یافتہ گھوڑے کی طرح جو ذرا سی تیز قدمی کے اشارہ پر اپنی "چال" کے سب قواعد بھول کر سرپٹ ہو جانے کا عادی ہو ہم بھی اپنی اختلافی گفتگو میں ضبط اور بردباری کے سب دائرے توڑ کر نکل جاتے ہیں۔

ان چند صفحات میں اُن نظریات اور طریقہ ہائے عمل کا ایک تجزیاتی مطالعہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے جو بارہا ملکی فضا کو مکدر کرنے کا موجب بن چکے ہیں اور بن رہے ہیں۔

والسلام

خاکسار

مرزا طاہر احمد

ربوہ

۱۸ $\frac{۱۲}{۶۲}$

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مذہب کے نام پر

خون

انسان کی تاریخ خاک و خون میں لتھڑی پڑی ہے۔ اُس دن سے لے کر آج تک جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا اِس قدر خونِ ناحق بہایا گیا ہے کہ اگر اُس خون کو جمع کیا جائے تو آج رُوئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے کپڑے اُس خون میں رنگے جا سکتے ہیں بلکہ شاید اس پر بھی وہ خون بچ رہے اور ہماری آئندہ آنے والی نسلوں کے لباس کو بھی لالہ رنگ کرنے کے لئے کافی ہو۔ مگر مقامِ حسرت ہے کہ اِس پر بھی آج تک انسان کی خون کی پیاس نہیں بجھی۔!

قابیل کے ہاتھوں ہابیل کا قتل وہ پہلا خونِ ناحق ہے جس کا ذکر قرآن اور بائیبل نے آج تک ہمیں عبرت دلانے کے لئے محفوظ کر رکھا ہے اور

یہ ذکر اُس دن تک محفوظ رہے گا جس دن آخری انسان صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے گا اور زمین کی صف لپیٹ دی جائے گی۔ لیکن انسان جب انسان کی تاریخ کی طرف اپنے ماضی کی جانب نگاہ کرتا ہے اور پھر آج کی دنیا میں اپنے حال، اپنے گرد و پیش پر ایک نظر دوڑاتا ہے تو یہ انکشاف ایک طعنہ بن کر اُس کے دل میں پھانس کی طرح چبھنے لگتا ہے کہ انسان پہلے بھی ظالم تھا اور آج بھی ظالم ہے۔ پہلے بھی جابر تھا اور آج بھی جابر ہے۔ اُس کی سفاکی کی داستان طویل ہے اور اس داستان کے ابواب لامتناہی ہیں اور وہ خون کی پیاس جو قابیل کے دل میں بھڑکی تھی آج بھی اَن گنت سینوں میں بھڑک سکتی ہے۔ یہ وہ آگ ہے کہ جو ہزاروں سال کی سیرابی کے بعد بھی ٹھنڈی نہ ہو سکی۔!

انفرادی قتلوں کی مثالیں بھی لاتعداد ہیں اور بے شمار ہیں اُس خونِ اجتماعی کی مثالیں بھی جو قوموں نے قوموں کے بہائے۔ سمندر کی نہ تھکنے والی لہروں کی طرح ایک خطۂ ارض پر بسنے والوں نے دوسرے خطۂ ارض پر بسنے والوں پر چڑھائیاں کیں اور ہجوم در ہجوم اور غول در غول غارتگروں کے لشکر نئے ممالک کی تسخیر کے لئے نکلے۔ قیصر نے بھی خون بہایا اور کسریٰ نے بھی۔ اسکندرِ اعظم کے ہاتھ بھی خون سے رنگین ہوئے اور نیرو کے بھی اور ہلاکو اور چنگیز کے ہاتھوں بھی بغداد کی تباہی آج تک تاریخ کے اوراق کو

شفق رنگ بنائے ہوئے ہے۔

یہ خون کبھی عزت و ناموس کے نام پر کئے گئے کبھی بغض و عناد کی بناء پر۔ کبھی رزق کی تلاش میں نکلی ہوئی فاقہ کش قوموں نے یہ مظالم ڈھائے اور کبھی محض تسخیر عالم جابر شہنشاہوں کا مطمح نظر تھی۔ پھر ایسا بھی بہت مرتبہ ہوا کہ یہ خونریزیاں خود خدا ہی کے نام پر کی گئیں اور مذہب کو آڑ بنا کر سفاکانہ بنی نوعِ انسان کا خون بہایا گیا۔ یہ سب کچھ ہوا اور آج بھی ہو رہا ہے اور اپنے کردار کا یہ رُخ دیکھ کر انسان کا دل بسا اوقات یاس و ناامیدی سے بھر جاتا ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ کیا اِسی لئے انسان کو پیدا کیا گیا تھا؟ ایک مذہب تھا کہ جس سے یہ توقع تھی کہ انسان کو انسانیت کے آداب سکھائے گا مگر خود اُس کا دامن بھی خون آلود نظر آتا ہے۔

یہ سوال طبعاً دل میں پیدا ہوتا ہے اور معاً خلقِ آدم کے اس واقعہ کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے جس کا ذکر قرآن اور بائیبل دونوں میں موجود ہے۔ قرآن کریم اس واقعہ کو یوں بیان فرماتا ہے کہ :۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ؕ قَالُوٓا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ إِنِّيٓ أَعْلَمُ

مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (سورۃ بقرہ ع۴)

"اُس وقت کو یاد کر، جب تیرے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ مَیں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا کہ کیا تُو وہاں ایک ایسا شخص بنائے گا جو اُس میں فساد کرے اور خون بہائے۔ حالانکہ ہم تو تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور قدوسیت کے گُن گاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا مَیں زیادہ جانتا ہوں اُن امور کو جن کی تمہیں کچھ خبر نہیں۔"

خدا تعالیٰ اور فرشتوں کا یہ مکالمہ پڑھ کر کچھ دیر کے لئے تو انسان ایک عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو جاتا ہے کیونکہ مذہب کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے تو بظاہر فرشتوں ہی کی بات درست معلوم ہوتی ہے۔ اور انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ اگر فرشتوں کا قول درست تھا تو خدا تعالیٰ نے پھر کیوں اُن کے مشورہ کو ٹھکرا دیا اور اُس اعتراض کو ردّ فرما دیا جو اُس کی نیابت یعنی سلسلۂ نبوّت پر وارد ہوتا تھا اور سب سے بڑھ کر اُس کے حقیقی نائب یعنی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ علیٰ آلہٖ وسلم اُس کی زد میں آتے تھے۔ ایک طرف اگر ہم مذہب کی تاریخ کا مطالعہ کریں خواہ دنیا کے کسی حصّہ سے تعلق رکھتی ہو، شمال کی ہو یا جنوب کی، مشرق کی ہو یا مغرب کی، ہمیں مذہب کے نام پر کئے ہوئے ایسے ایسے ہولناک مظالم کا پتہ چلتا ہے کہ اُن کے پڑھنے سے بھی رونگٹے

کھڑے ہوجاتے ہیں اور نظر مایوس ہو کر واپس لوٹتی ہے۔ اُس وقت دل میں کچھ اِس قسم کے خیالات منڈلانے لگتے ہیں کہ ؎

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

مذہب جس سے توقع تھی کہ وہ انسانیت کو فساد اور خونریزی سے نجات دلائے گا وہ تو خود ہی انسانیت کے خون میں ملوّث نظر آتا ہے۔

دوسری طرف جب خدا تعالیٰ کے اِس قطعی فیصلہ کی طرف انسان کی نظر پڑتی ہے کہ مذہب کو ہرگز فساد اور خونریزی کی غرض سے قائم نہیں کیا جا رہا۔ یہ خیال کم علمی کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اور سراسر بے بنیاد ہے تو اگرچہ تعجب کم نہیں ہوتا مگر یاس کی تاریکی میں امید کی ایک کرن پھر روشن ہو جاتی ہے۔ انسان خوشی اور حیرت کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ خدا تعالیٰ کے اِن فیصلہ کو دیکھتا ہے کہ وہی نائبِ حقیقی جس کے متعلق فرشتوں نے اِس شبہ کا اظہار کیا تھا کہ وہ زمین میں فساد کرے گا خدا تعالیٰ کے حضور مصلحِ اعظم کا مقام پاتا ہے اور اُس کے مذہب کا نام ہی "اسلام" رکھا جاتا ہے یعنی سلامتی اور امن کا مذہب۔ سوال مگر پھر بھی قائم رہتا ہے کہ یہ مانا کہ عالم الغیب خدا کا فیصلہ درست ہے اور باقی سب اندازے غلط۔ مگر پھر وہ مقام کون سا ہے جہاں پہنچ کر تاریخِ مذاہب پر دوڑنے والی ایک سرسری نظر ٹھوکر کھا جاتی ہے۔ اور وہ مغالطہ کیا ہے جس

بیں پڑ کر بعض مذہب کے مخالفین یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ مذہب امن کے نام پر فساد اور سلامتی کے نام پر خونِ ناحق کی تعلیم دیتا ہے۔

قرآن کریم نہایت ہی لطیف پیرائے میں اِس مغالطہ کی نشان دہی کرتا ہے اور بڑی وضاحت کے ساتھ بار بار مذاہب کی تاریخ کے مختلف حوالہ جات سے یہ ثابت فرماتا ہے کہ مذہب کے نام پر ظلم کرنے والے ہمیشہ یا تو خود لا مذہب ہؤا کرتے ہیں یا پھر وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر مذہب کا شائبہ بھی باقی نہیں ہوتا اور جن کے مذہب امتدادِ زمانہ سے بگڑ کر کچھ کا کچھ بن چکے ہوتے ہیں۔ یا پھر ایسے مذہبی علماء اس ظلم کے ذمہ دار ہوتے ہیں جن کا مذہب سے تعلق محض نام کا ہوتا ہے اور اُن کے دل روحانیت، رحمت، شفقت اور خدمتِ خلق کے پاکیزہ مذہبی جذبات سے عاری ہو کر چالاکی، ریا کاری اور سفاکی کی آماجگاہ بن جاتے ہیں۔ پس ایسے مذہبی راہنماؤں کی بداعمالیوں کو مذہب کی طرف منسوب کرنا مذہب پر ایک بڑا بھاری ظلم ہے۔ اور حق بات یہی ہے کہ وہ خدا جو تمام رحمتوں کا سرچشمہ ہے کسی مذہب کے ماننے والوں کو اپنے بندوں پر ظلم کی تعلیم نہیں دے سکتا۔

قرآن کریم نے تاریخِ عالم سے بعض مثالوں کو پیش فرما کر تصویر کا رُخ ہی یکسر بدل دیا ہے اور پانسے کو ایسا پلٹا ہے کہ الزام دینے والے خود موردِ الزام بن گئے۔ چنانچہ قرآن کریم اپنے دعویٰ کی تائید میں انبیاء کے ابتدائی زمانے

کو ایک معیار اور کسوٹی کے طور پر پیش فرماتا ہے اور بار بار مختلف انبیاءؑ کی جماعتوں کا ذکر کر کے اُن کے تاریخی حالات سے یہ استدلال فرماتا ہے کہ مذہب کی طرف سے اگر کوئی ظلم روا رکھا جاتا تو ظاہر بات ہے کہ سب سے زیادہ ظلم کرنے والے خود مذہب کے بانی ہوا کرتے یا اُن کے وہ متبعین ہوتے جنہوں نے اُس مذہب کو خود اُس مذہب کے بانی سے سیکھا اور اُسی سے تعلیم پائی اور اُسی کے اُسوہ کے مطابق اپنے اعمال اور اخلاق کو ڈھالا۔ نہ کہ وہ لوگ جو اُن لوگوں کے بہت بعد پیدا ہوئے اور یا تو انہوں نے اپنے مذہب کو بگڑی ہوئی حالت میں دیکھا یا اپنی اخلاقی گراوٹ کی وجہ سے اپنے ہی خیالات کی پیروی کی اور مذہب کو پسِ پشت ڈال دیا۔

مذہب کی جو تاریخ قرآن کریم بیان فرماتا ہے اس میں بار بار ہمیں ایسے نظارے نظر آتے ہیں کہ ظلم تو کیا جا رہا ہے مذہب کے نام پر مگر کیا جا رہا ہے لامذہب لوگوں کی طرف سے۔ تشدد تو کیا جا رہا ہے خدا کے نام پر مگر کیا جا رہا ہے ایسے لوگوں کی طرف سے جو خدا کے حقیقی تصور سے بھی ناآشنا تھے۔ چنانچہ قرآن کریم حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق فرماتا ہے کہ جب نوحؑ نے دنیا کو ہدایت اور نیکی کی طرف بُلایا تو نوحؑ ظالم نہیں تھے بلکہ وہ لوگ ظالم تھے جو مذہب کے نام سے ناآشنا تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُن لوگوں نے حضرت نوحؑ کے پیغام کو سُن کر کہا:۔

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ٥

(سورہ شعراء ع ۶)

کہ اے نوح! اگر تم اپنے اِس مذہب سے باز نہ آئے اور اپنا موجودہ رویّہ تبدیل نہ کیا تو ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔

گویا کہ قرآن کریم کی رُو سے مذہب کے نام پر ظلم سچے مذہب کو ماننے والوں پر ہوا ہے، سچے مذہب کے ماننے والوں نے نہیں کیا۔ پھر حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال آتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے امن اور محبّت اور ہمدردی اور حلم کے ساتھ دنیا کو خدا کے سچے رستے کی طرف بلایا۔ اُن کے ہاتھ میں کوئی تلوار نہیں تھی، کوئی تشدّد نہیں تھا، کوئی ظلم کا ذریعہ نہیں تھا لیکن قوم کے لیڈروں نے وہی کہا جو اِس سے پہلے نوحؑ کے زمانہ کے لامذہب لوگوں نے کہا تھا۔ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ (سورہ مریم ع ۳) کہ "اگر اپنے اِس عقیدہ اور تبلیغ سے باز آ جاؤ تو ٹھیک ہے ورنہ میں تمہیں ضرور سنگسار کر دوں گا۔" یہ الفاظ آذر نے حضرت ابراہیمؑ سے کہے تھے۔ اب دیکھئے کہ بعینہٖ وہی الفاظ جو حضرت نوحؑ کے زمانے کے لامذہب لوگوں نے حضرت نوحؑ کے متعلق استعمال کئے تھے، حضرت ابراہیمؑ کے زمانے کے لامذہب لوگوں نے بھی حضرت ابراہیمؑ کو اُنہی الفاظ میں دھمکیاں دیں اور یہ معاملہ دھمکیوں تک ہی نہیں رہا بلکہ حضرت نوحؑ اور آپؑ کی قوم پر جو ظلم ڈھائے

گئے، وہ ایک معلوم حقیقت ہیں۔ اُن کو تحقیر کا نشانہ بنایا گیا، اُن پر تمسخر کیا گیا، اُن کو زدوکوب کیا گیا، مگر وہ حلم اور صبر کے ساتھ ثابت قدم رہے حضرت ابراہیمؑ پر بھی ایک مخالفت اور فتنے کی آگ بھڑکا دی گئی اور ظاہراً تمام میں بھی اُن کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال کر زندہ جلانے کی کوشش کی گئی۔

حضرت لوطؑ کے وہ منکرین جو مذہب کے نام سے ناآشنا تھے انہوں نے بھی مذہب ہی کا نام لیکر حضرت لوطؑ اور حضرت لوطؑ کے ماننے والوں پر ظلم ڈھائے اور اُن کو بھی اسی قسم کی دھمکیاں دی گئیں۔ چنانچہ حضرت لوطؑ کے ماننے والوں نے آپ کو اپنے ملک سے نکالنے کی دھمکی دی اور بار بار حملہ کر کے چڑھ آتے رہے اور دھمکاتے رہے اور ڈراتے رہے کہ کسی طرح یہ اپنے مذہب کی پُرامن تبلیغ سے باز آجائیں۔ اور حضرت شعیبؑ کے مخالفین نے بھی یہی طریق اختیار کیا اور حضرت شعیبؑ سے کہا۔ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۞ (سورۃ الاعراف: ۸۹)

کہ اے شعیب! یا تو ہم تم کو اور جو لوگ تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنے شہر سے نکال دیں گے یا تم ہمارے مذہب میں ضرور واپس آجاؤ گے یعنی تم پر اتنی شدت کی جائے گی، اتنی سختی کی جائے گی کہ زندگی تم پر اجیرن ہو جائے گی۔ تم نے ارتداد کا جو طریق اختیار کیا ہے یعنی ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرے

مذہب کی پیروی شروع کردی ہے بہرطریق تمہیں بہرحال بدلنا پڑیگا اس لئے ہم تمہیں یہ موقعہ دے رہے ہیں اور تمہیں متنبہ کر رہے ہیں۔" اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ؟" حضرت شعیبؑ نے فرمایا کہ کیا اس صورت میں بھی کہ ہمارا دل تمہارے مذہب کی تائید نہ کرتا ہو ؟ کیا اس طرح بھی دنیا میں کسی کو کسی مذہب کا پیرو اور پابند کیا جاتا ہے ؟ کہ دل گواہی دیتا ہو کہ وہ مذہب جھوٹا ہے اور بے اختیار اُس مذہب سے بھاگ کر کسی پُرامن مذہب کی امان میں آجانا چاہتا ہو تب بھی کیا اُسے مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے دل کی گواہی کے خلاف اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف ایک ایسے عقیدہ کو قبول کرے جس پر اس کا دل تسلی نہیں پاتا۔

"قتلِ مرتد" کے خلاف حضرت شعیبؑ کی یہ ایک ایسی چٹان کی طرح مضبوط اور ناقابلِ تردید دلیل ہے کہ آج تک اس کا جواب کسی سفاک سے بن نہیں پڑا کیونکہ ہر انسانی عقل اور ہر انسانی دل اس امر پر ہمیشہ سے شاہد ہے کہ تلوار کو نہ کبھی پہلے دلوں پر حکومت نصیب ہوئی نہ کبھی آئندہ ہوگی۔ اُسے ہڈیوں اور گوشت پوست پر تو اختیار حاصل ہو جاتا ہے مگر عقل اور جذبات اور عقائد کی دنیا تک اُس کی کوئی رسائی نہیں۔ یہ انسانی فطرت کی ایک غیر مبدّل آواز ہے اور یہ بنیادی فطرت وہی ہے جو آدمؑ کو عطا ہوئی تھی اور دنیا کا سب سے آخری انسان بھی اسی فطرت پر مرے گا۔ انسان

کی یہ فطرتی آواز کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی اور وہ مظلوم جن کو مذہب کے نام پر مذہب سے نا آشنا راہنماؤں نے مُرتد ٹھہرا کر واجب القتل قرار دیا ہے انکے دلوں کی آواز ہمیشہ اسی طرح بلند ہوتی رہے گی کہ کیا تم ہمیں اپنے بگڑے ہوئے عقائد کو ماننے پر اس وقت بھی مجبور کر رہے ہو جبکہ ہمارا دل اُن سے یکدفعہ بیزار ہو چکا ہے۔ مگر حسرت کا مقام ہے کہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے اور مذہب کے نہ ماننے والوں نے ہر نبی اور اُس کی قوم پر ارتداد کے فتوے لگائے، اُنہیں واجب القتل قرار دیا اور ظلم و ستم کی وہ وہ راہیں ایجاد کیں کہ اُن کے ذکر سے بھی انسانیت شرما جاتی ہے۔

پھر دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپؑ کے متبعین سے بھی یہی ہوا اور فرعون نے بھی وہی کہا جو اُس سے پہلے گزشتہ قوموں کے نام نہاد مذہبی لیڈر کہا کرتے تھے۔ اور وہی ظلم کی راہ اختیار کی جو خدا کے برگزیدہ بندوں کے متعلق ازل سے ظالم اختیار کرتے آئے تھے۔ چنانچہ فرعون نے اپنے متبعین کو حکم دیا:-

اُقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ۔ (سورۃ مؤمن عٓ)

کہ اے میرے مطیع اور فرمانبردار اربابِ اقتدار! ان لوگوں کو جو موسیٰؑ پر ایمان لاتے جبر کے ساتھ باز رکھو اور "اُن

کہ بیٹوں کو تو قتل کر دو اور اُن کی بیٹیوں کو زندہ رکھو۔"

پس دیکھئے کہ مذہب کے نام پر جرم ارتداد کی یہ سزا بھی انبیاء کی جماعتوں نے نہیں دی بلکہ انبیاءؑ کی جماعتوں کو دی گئی۔ پھر اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی کیسے کیسے مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ یہاں تک کہ دشمنوں نے گویا اُن کو سُولی پر چڑھا کر مارنے کی کوشش کی اور اُن کے ماننے والوں پر بھی کئی قسم کے مظالم ڈھائے۔ پس یہ سلسلۂ ظلم وستم جو آج تک مذہب کے نام پر روا رکھا گیا ہے اور جس کا نام ہمیشہ ارتداد کی سزا رکھا گیا اس کی ہرگز کوئی سند بھی مذہبی صحیفوں میں نہیں ملتی۔ میری مراد ہے اُن صحیفوں میں نہیں ملتی جو صحیفے خدا تعالیٰ نے اپنے انبیاء پر اُتارے۔ اُن کی بگڑی ہوئی صورت میں انبیاء کے گزر جانے کے سینکڑوں سال بعد اگر بعد کے بددیانت لوگوں نے اُن میں کتر بیونت کر کے یا اپنے خیالات ٹھونس کر اُن میں ظلم کی تعلیم بھر دی ہو تو خدائی صحیفے اس سے بری الذمہ ہیں۔

قرآن کریم نے تاریخ مذاہب کے ناقابلِ تردید حوالہ جات سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انبیاءؑ اور اُن پر ایمان لانے والے مخلصین دنیا کے مظلوم ترین لوگ تھے۔ جن پر شدید مظالم ڈھائے گئے لیکن اُنہوں نے نہایت صبر اور استقامت کے ساتھ محض خدا کی خاطر اُن مظالم کو برداشت کیا۔ اس تاریخ کو پڑھنے کے بعد دنیا کا کوئی انسان جو ذرا سی عقل بھی اپنے اندر رکھتا ہو یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مذہب

کی طرف سے مذہب کو چھوڑنے پر ظلم روا رکھا جاتا رہا ہے۔ خدا کے انبیاءؑ تو ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب میں داخل ہونے کی تعلیم دیتے ہیں۔ جب وہ خود یہ تعلیم دیتے ہیں تو وہ یہ کس طرح برداشت کر سکتے ہیں کہ محض اس بناء پر کہ کوئی شخص کسی مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب میں داخل ہوتا ہے اُس پر کسی قسم کا ظلم یا جبر روا رکھا جا سکے۔ قرآن کریم سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ صرف انبیاء کی جماعتیں ہی نہیں بلکہ اُن کے بعد بھی۔ انبیاءؑ کے گزرنے کے سینکڑوں سال بعد بھی ایسے شرفاء دنیا میں ہوا کرتے ہیں جن پر اُس زمانے کے ظالم لوگ مذہب کا نام لیکر ظلم کرتے ہیں مگر حقیقۃً خدا تعالیٰ کی مرضی یا تائید ان کو حاصل نہیں ہوتی اور مذہب سے اس ظلم کو دُور کا علاقہ بھی نہیں ہوتا چنانچہ اس ضمن میں قرآن کریم اصحابِ کہف کی مثال بیان فرماتا ہے۔ یہ وہ عیسائی لوگ تھے جو تین صدیوں تک عیسائیت کے مخالفین کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے رہے۔ اُن کو اتنا تنگ کیا گیا، ایسے ایسے شدید مظالم اُن پر ڈھائے گئے کہ اُن کی یاد سے آج بھی سینوں میں دل خون ہو جاتے ہیں۔ مَیں نے خود وہ عمارتیں دیکھی ہیں جن عمارتوں میں ان عیسائیوں پر ظلم ڈھائے جاتے تھے۔ ان کو کولی سیَم (Collisinum) کہا جاتا ہے۔ پرانے رومن زمانوں میں یہ ایک قسم کے تھیٹر ہوا کرتے تھے یعنی تماشا گاہیں۔ جہاں کہ پہلوانوں کی لڑائیاں اور شیروں اور بھینسوں کی لڑائیاں ہوا کرتی تھیں۔

جس زمانے کا ذکر قرآن کریم میں آتا ہے اُس زمانے میں اِنہی تماشاگاہوں کو عیسائیوں پر ظلم کرنے کا ایک ذریعہ بنا لیا گیا اور ایک طرف تو پنجرے میں بھوکے شیر یا دوسرے جنگلی درندے جن کو کئی کئی دن فاقے دیکر رکھا جاتا تھا بند ہُوا کرتے تھے اور دوسری طرف پنجروں میں وہ عیسائی بند ہوتے تھے جن کے متعلق اُس زمانے کے مذہبی راہنماؤں کا یہ فتویٰ تھا کہ یہ مُرتد ہیں کیونکہ انہوں نے ایک دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کر لیا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو پنجروں میں یہ "مرتدین" تھے۔ وہ بھوکے تھے، وہ بھی ننگے تھے، وہ بھی کئی کئی دن تک پانی اور روٹی سے محروم رکھے جاتے تھے۔ جس سے اُن کی کمزوری اس حد تک بڑھ جاتی تھی کہ ان کے لئے کھڑا ہونا دشوار ہو جاتا تھا۔ اور اس کے برعکس بھُوکے اور پیاسے درندے اور بھی خونخوار ہو جاتے تھے اور بھُوک کی شدّت سے غضبناک ہو کر ایک وحشیانہ جنگلی چیخ کے ساتھ بجلی کے کوندوں کی طرح اپنے شکار پر لپکتے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی ہڈیاں تک چبا جاتے تھے اور وہ تمام تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہُوا ہال قہقہوں سے گونج جاتا تھا کہ ہاں یہ ہے مرتدین کی سزا۔ اور اُس شام وہ قہقہے لگاتے ہوئے، مذاق کرتے ہوئے اپنے گھروں کو لَوٹا کرتے تھے یہ دعوے کرتے ہوئے کہ فتنۂ ارتداد کو مٹانے کا بس یہی ایک مؤثر طریق ہے۔ کبھی بھُوک کے ستائے ہوئے بھیڑیے اُن پر چھوڑے جاتے تھے جنہیں غیر مانوس ماحول اور انسانوں کے جمِ غفیر کا اجنبی

منظر وحشت سے دیوانہ کر دیتا تھا۔ اور جب وہ ان مظلوم عیسائیوں کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھتے تھے تو اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا اور بے پناہ نفرت اور غیظ و غضب کی آگ اُن کے سینوں میں بھڑک اُٹھتی تھی اور سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگتی تھی۔ چنانچہ وہ سر پھینک کر اپنے تنفس کی مخصوص انتقامی آواز کے ساتھ جو چوپاؤں کے سانس کی نسبت سانپوں کی پھنکار کے زیادہ مشابہ ہوتی ہے اپنے نحیف و زار شکار پر حملہ آور ہوتے تھے اور کبھی اُنہیں اپنے سینگوں میں پروتے اور کبھی اپنے سُموں کے نیچے رَوند ڈالتے تھے اور ان مظلوموں کی درد میں ڈوبی ہوئی آہیں تماش بینوں کے شور میں کھو جاتی تھیں۔ لیکن ان "مومنین" کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی اور اُن فاقہ کشوں کے نحیف لڑکھڑاتے ہوئے قدم اُن کے ایمانوں کو ڈگمگا نہ سکے اور وہ بے مثالی ایمانی جرأت کے ساتھ یقینی موت کی طرف بڑھتے رہے اور کبھی تو درندوں کے مُنہ کا نوالہ بن گئے اور کبھی جنگلی بھینسوں کے سینگوں کا ہار ہو گئے۔

یہ ظلم مختلف وقتوں میں برابر تین صدیوں تک عیسائیوں پر توڑے گئے یہاں تک کہ جب انہوں نے دیکھا کہ ان انسان کہلانے والوں میں ہمارے لئے کوئی سر چھپانے کی جگہ نہیں تو وہ سطح زمین کو چھوڑ کر زیرِ زمین غاروں میں چلے گئے۔ وہ غاروں کے چوہوں اور کیڑوں مکوڑوں اور سانپوں اور بچھوؤں میں تو رہ سکتے تھے مگر سطح زمین پر بسنے والے انسانوں میں اُن کے لئے کوئی

کوئی جگہ نہ تھی۔ کیونکہ یہ موذی جانور جبّہ پوش مذہبی راہنماؤں کی نسبت اُن کے لیے کم خطرناک تھے۔

ان زیرِ زمین بسنے والے "اصحابِ کہف" کے علاوہ قرآن کریم ایسے ابتدائی موحد عیسائیوں کا بھی ذکر کرتا ہے جنہیں لامذہب حکمرانوں کی طرف سے مذہب ہی کے نام پر زندہ آگ میں جلا دیا گیا محض اس جرم کی پاداش میں کہ وہ خدائے عزیز و حمید پر ایمان لائے تھے۔ چنانچہ اُن کا ذکر کرتے ہوئے سورۃ البروج میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۙ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۙ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ؕ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۙ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۙ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۙ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ؕ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ؕ (البروج ع)

جس کا آزاد ترجمہ یہ ہے کہ:۔

"قسم ہے بُرجوں والے آسمان کی اور موعود دن کی اور ایک عظیم الشان گواہی دینے والے کی اور اُس عظیم الشان ہستی کی

جس کی گواہی دی گئی کہ خندقوں والے ہلاک ہو گئے یعنی خندقوں میں وہ آگ بھڑکانے والے جس میں خوب ایندھن جھونکا گیا تھا۔ اور کیا ہی ہولناک تھا وہ وقت جب وہ اُن کھائیوں کے کنارے پر بیٹھے ہوئے جلتے ہوئے مؤمنین کا نظارہ کر رہے تھے۔ اور اُن سے اُن کی ناراضگی کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ تھی کہ وہ خدائے عزیز و حمید پر جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے ایمان لے آئے تھے۔ اور خدا تعالیٰ ہر چیز پر نگران ہے"

قرآن کریم اِس امر کے ثبوت میں کہ مذہب کے نام پر ظلم کرنے والے دراصل خود بے دین ہوا کرتے ہیں ایک اور ناقابلِ تردید ثبوت پیش کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ خدا کے نام پر خدا ہی کی عبادت سے روکتے ہیں اور ان کا یہ ظلم ان مؤمنین کے نزدیک تمام جسمانی اذیتوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سورۃ البقرہ رکوع ۱۴ میں فرماتا ہے :-

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ

کہ اِن مذہب کے جھوٹے دعویداروں سے بھی زیادہ ظالم کوئی ہو سکتا ہے کہ خدا کا نام لے لے کر خدا ہی کی عبادت سے روکتے ہیں اور مسجدوں میں اُس کے ذکر کو بلند کرنے سے منع کرتے

ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ وہ ویران ہو جائیں۔"

غرضیکہ قرآن نے نہایت لطیف پیرایہ میں مذہب پر پڑنے والے اس خونی الزام کو ردّ فرمایا ہے اور یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ اس مقدس نام پر دنیا میں مکروہ ترین مظالم ڈھائے گئے سچے مذاہب کے سچے متبعین کو اس ظلم و تعدّی سے کلیۃً بری الذمہ قرار دیا ہے۔

یہ تو گزشتہ انبیاءؑ کے ساتھ انسانوں کا سلوک تھا جبکہ ابھی خدا کے نور کا کامل ظہور نہیں ہوا تھا۔ لیکن جب اُس کامل ظہور کا وقت آیا اور جزیرہ نمائے عرب کے اُفق سے وہ مجسّم صداقتوں کا سورج طلوع ہوا تو بھی ان بے دین ظالموں نے اپنے تیور نہ بدلے۔ جب وہ دنیا کا سردارؐ آیا جس کی ہزاروں سال سے آدم زادوں کو انتظار تھی اور جس کی راہ تکتے تکتے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اس دنیا سے گزر گئے۔ وہ جس کی خاطر کائنات کو پیدا کیا گیا۔ جس کی شریعت سب شریعتوں سے زیادہ روشن اور جس کی شان سب نبیوں سے بلند اور بالا تھی۔ وہ انسانیت کی شان، وہ خدا کے جلال اور جمال کا مظہر، وہ سب نبیوں سے زیادہ معصوم نبیؐ جب دنیا میں ظاہر ہوا تو اُس کو بھی ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا اور ایسے دردناک ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا کہ اُس کی نظیر تاریخِ مذاہب میں نظر نہیں آتی۔

وہ ساری آفتیں جو گزشتہ انبیاءؑ پر علیحدہ علیحدہ توڑی جاتی تھیں

اس ایک نبیؐ اور اُس کی جماعت پر توڑی گئیں۔ انہیں چلچلاتی دھوپ میں تپتی ریت پر ننگے لٹایا گیا اور ان کی چھاتیوں پر دہکتے ہوئے پتھروں کی سلیں رکھی گئیں۔ انہیں مکہ کی پتھریلی گلیوں میں مرے ہوئے جانوروں کی طرح رسیاں باندھ کر گھسیٹا گیا۔ سالہا سال تک اُن کے مقاطعے کئے گئے۔ انہیں بھوک اور پیاس کی شدید اذیتیں پہنچائی گئیں۔ کبھی اُن کو تنگ اندھیری کوٹھڑیوں میں قید کیا گیا اور کبھی اُن کے اموال و متاع لُوٹ کر گھروں سے نکال دیا گیا کبھی بیویوں کو خاوندوں سے چھڑایا گیا کبھی خاوندوں کو بیویوں سے علیحدہ کر دیا گیا۔ مقدس حاملہ عورتوں کو اونٹنیوں سے گرا کر اُن پر قہقہے لگائے گئے اور وہ اس صدمہ سے جاں بحق ہو گئیں۔ اُن پر عبادت کے دوران میں اونٹوں کی اوجڑیاں پھینکی گئیں۔ اُن کو گالیاں دی گئیں اور گلیوں کے اوباشوں نے اُن کی تحقیر اور تذلیل کی۔ دنیا کے ذلیل ترین آوارہ لونڈوں نے جھولیوں میں بھر بھر کر اُن پر پتھر برسائے۔ یہاں تک کہ دنیا کا مقدس ترین خون طائف کی گلیوں میں بہنے لگا۔ اُن کو زہر دیئے گئے۔ اُن پر شعلہ آسا جنگوں کی آگ بھڑکا دی گئی اور تلواروں کے نیچے قربانیوں کی طرح ذبح کیا گیا۔ اُن پر تیروں اور پتھروں کی بارشیں برسائی گئیں اور اُحد کی سرزمین گواہ ہے کہ سنگدل سفاکوں نے کائنات کی معصوم ترین ہستی کے دانت شہید کر دیئے۔ ہاں اُن کو نیزوں میں پرو دیا گیا اور اُن کے سینے چیر کر اُن کے جگر چبا لیے گئے اور وہ کام جو روم

کے سفاک بادشاہ جنگل کے درندوں سے لیا کرتے تھے عرب کے درندہ صفت انسانوں نے خود کرکے دکھا دیئے۔

مذہب کے نام پر یہ بے مثال خونریزی صرف اس لئے کی گئی کہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ رَبُّنَا اللّٰہُ "ہمارا رب اللہ ہے" اور مذہب کے نام پر یہ خونریزی صرف اس لئے کی گئی کہ مشرکینِ مکہ کے نزدیک یہ لوگ "مرتد" تھے۔ چنانچہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ کا اور آپؐ کے ماننے والوں کا نام مشرکین نے صابی رکھ دیا تھا۔ صابی ایسے شخص کو کہتے ہیں جو اپنا آبائی دین چھوڑ کر کوئی نیا دین اختیار کرلے۔ چنانچہ اس "فتنۂ ارتداد" (نعوذ باللہ من ذٰلک) کو دبانے کے لئے اُنہوں نے وہ سارے طریق اختیار کئے جو اُن سے پہلے مذہب کے نہ ماننے والے انبیاءؑ اور اُن کی جماعتوں کے خلاف اختیار کرتے آئے تھے۔ ایک لمبا زمانہ ہے یہ تکلیفوں کا جو مذہب کے نہ ماننے والوں نے مذہب کے علمبرداروں کو دیں بلکہ ایک ایسی قوم کو دیں جو مذہب کے آسمان پر چاند اور سورج بن کر چمکے تھے، جو مذہبی ارتقاء کی انتہا تھے، جن کے طے شدہ مقامات سے آگے اَور کوئی مقام نہ تھا، جن سے بہتر لوگ نہ کبھی کسی پہلے مذہب نے پیدا کئے تھے نہ آئندہ کبھی اس دنیا میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ تخلیقِ عالم کا شاہکار نبیؐ اور اُس کے شیدائی نہایت ہی صبر اور حلم کے ساتھ اور غیر معمولی قوّتِ برداشت کے ساتھ ان مظالم کو سہتے رہے اور اُف

نہ کی۔ اور اپنے دُکھوں اور اپنی قربانیوں اور اپنے بہتے ہوئے خون سے یہ ثابت کر دیا کہ ظالم اور فسادی مذہب کے مخالفین ہوا کرتے ہیں مذہب کے ماننے والے نہیں۔

صرف اِسی پر بس نہیں کی بلکہ صبر و تحمّل کی صفات کے لاثانی اظہار کے بعد رحم اور شفقت اور عفو کے وہ کمال دکھائے کہ عقلِ انسانی حیران ٹکٹکی باندھے دیکھتی ہے کہ یہ کون لوگ تھے اور کیسے ان ارفع مقامات تک جا پہنچے۔ چنانچہ اُس وقت جبکہ خدائی نصرت کے وعدوں کے ایفاء کا وقت آیا اور کفّارِ مکّہ کی گردنیں اُن کے ہاتھ میں دی گئیں۔ جب دس ہزار قدوسیوں کی چمکتی ہوئی تلواروں کے نیچے عرب کے سفّاک سرداروں کے سر کانپنے لگے تو مکّہ کی اینٹ اینٹ گواہ ہے کہ تاریخِ عالم نے ایک عجیب معاملہ دیکھا اور قتلِ عام کے فرمان کی بجائے مکّہ کی فضاؤں میں لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ کے شادیانے بجنے لگے۔ اُس روز دنیا کے ظالم ترین انسان معاف کئے گئے۔ تپتی ریت پر بے کس غلاموں کو لٹانے والے بھی معاف کئے گئے۔ چلچلاتی دھوپ میں مکّہ کی گلیوں میں ناداروں کو گھسیٹنے والے بھی معاف کئے گئے۔ اُس روز معصوم انسانوں پر پتھروں کی بارش برسانے والے بھی معاف کئے گئے۔ اور قاتل اور فسادی اور بدعہد اور لٹیرے بھی معاف کر دیئے گئے اور ابھی کچھ مدّت نہ گزری تھی کہ اُن سنگدلوں کو بھی معاف کر دیا گیا جنہوں نے معزز

انسانوں کے سینے چیر کر اُن کے دل اور جگر پر چھا لیئے تھے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْد۔

پس مَیں یہ کہتا ہوں کہ اگر آدمؑ سے لے کر حضرت محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے ظہور تک کی ساری مذہبی تاریخ بھی مٹا دی جائے اور آپؐ کے وصال سے لے کر آج تک کی تاریخ کو بھی ملیا میٹ کر دیا جائے تو بھی اس بزرگ نبیؐ کی چند سالہ تاریخ ہی اِس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ مذہب ظلم اور تعدّی اور شقاوتِ قلبی اور نفرت نہیں سکھاتا بلکہ رحم اور شفقت اور صبر اور بُردباری کی تعلیم دیتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی ناحق نہ ہوگا کہ جب تک فقط اُس ایک روز یعنی فتح مکّہ کے دن کی یاد تاریخ میں باقی رہیگی مذہب کے چہرہ پر ظلم کا داغ نہ لگ سکے گا، نہ لگ سکے گا!

صرف اِسی پر بس نہیں کی بلکہ وہ رحمۃٌ للعالمینؐ ظلم کے انسداد کے لئے ایک قدم اَور آگے بڑھا اور خدا سے وحی پا کر ہمیشہ ہمیش کے لئے یہ اعلانِ عام کر دیا کہ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔ دین کے نام پر کوئی جبر جائز نہیں۔ اور اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ۔ حق اپنے نورانی چہرہ کے ساتھ ممتاز ہو گیا اور کجی کے ساتھ اُس کے اشتباہ کا کوئی سوال باقی نہیں رہا۔

یہ اعلان اِس پس منظر میں ایک عجیب اعلان نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو ظالم ہیں کہ جو ظلم و تعدّی کے ساتھ چند کمزور اور ناتواں لوگوں کو "ارتداد" کے جرم کی سزا میں صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپے ہیں اور مجبور کر رہے ہیں کہ یہ نیا مذہب چھوڑ دو اور اپنے پہلے مذہب میں واپس آجاؤ اور دوسری طرف اُس مذہب کے ماننے والے جب قوت پکڑ جاتے ہیں تو باوجود اُس قوت کے اُن کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (سورۃ البقرۃ ع۳۴) کہ دین میں کوئی جبر نہیں اور حق اپنی تمام صداقتوں کے ساتھ واضح ہو چکا ہے اور کجی کا رستہ ایک ایسا رستہ ہے جسے حق کے ساتھ مشتبہ نہیں کیا جا سکتا۔ .... پس جو خدا تعالیٰ پر ایمان لائے گا اُس کی مثال ایسی ہی ہو گی جیسے ایک مضبوط کڑے پر اُس کا ہاتھ پڑ جائے جس کڑے کے لئے ٹوٹنا نہ لکھا ہو۔ یہ اعلان کتنا شاندار اور کیسا پُرامن اعلان ہے۔

پس اے مذہب کے نام پر ظلم کرنے والو! تم مذہب کی حقیقت ہی سے ناآشنا ہو۔ مذہب تو دلوں کی تبدیلی کا نام ہے۔ مذہب کوئی سیاسی جماعت نہیں، مذہب کوئی قوم نہیں ہے، مذہب کوئی ملک نہیں ہے، مذہب تو اُس پاک

رُوحانی تبدیلی کو پیدا کرنے کے لئے آتا ہے جو دلوں کی گہرائیوں میں ہوتی ہے اور جس کا تعلق روح کے ساتھ ہے۔ اور کوئی تلوار اور کوئی طاقت اور کوئی جبر اور کوئی تشدد خواہ کتنا ہی ہیبت ناک کیوں نہ ہو دلوں کو تبدیل کرنے کی اتنی بھی طاقت نہیں رکھتا جتنی ایک حقیر چیونٹی بلند و بالا پہاڑوں کو اپنی جگہوں سے ٹلانے کی رکھتی ہے۔ پھر ایک دوسری جگہ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ اعلان فرمایا کہ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ قف فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ کہ کہدو کہ حق تو تمہارے رب کی طرف سے آچکا اِس کے بعد کسی جبر کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ حق تو کہتے ہی اُس چیز کو ہیں جو دلوں کو اپنی صداقت کے ساتھ منوائے جس کا لوہا روحیں مانیں۔ جس کا جسم کے جبر و تشدد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ پس فرمایا کہ یہ اعلان کر دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آچکا فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (سورۃ الکہف ع۴) اب تمہیں اختیار ہے چاہو تو ایمان لاؤ چاہو تو ایمان نہ لاؤ۔

پھر ایک دوسری جگہ فرمایا۔ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ (سورۃ دہر ع۲) کہ یہ تو ایک نصیحت کی بات ہے فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ پس اِس نصیحت سے متاثر ہو کر جو چاہے وہ اپنے رب کا رستہ پکڑ لے۔ کتنی عمدہ اور پیاری تعلیم ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اِس کے بعد بھی لوگ یہ تصور کس طرح کر سکتے ہیں کہ مذہب

ظلم اور جبر اور تشدد کی تعلیم دیتا ہے۔

ایک اور مقام پر مزید وضاحت کرتے ہوئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے قُلِ اللّٰہَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّہٗ دِیْنِیْ[1] کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! تُو اعلان کر دے کہ میں تو اپنے رب کی پورے خلوص کے ساتھ عبادت کرتا ہوں یعنی میرا تو سب کچھ اُسی کا ہو گیا ہے اور میرا دین اُسی کے لئے خالص ہے۔ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ[1] رہے تم۔ تو جس کی چاہو اُس کے سوا عبادت کرتے پھرو مجھے تو اپنا رستہ مل گیا ہے۔ کیسی عجیب تعلیم ہے امن کی کہ اِس کے ہوتے ہوئے مذہب کے نام پر کسی ظلم کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ پھر فرمایا لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ[2] کہ تمہارے لئے تمہارا دین ہے۔ وَلِیَ دِیْنِ میرے لئے میرا دین ہے۔ چنانچہ مذہب کے علمبردار ہمیشہ بلا استثناء ایک ہی دعویٰ رکھتے رہے اور اس دعوے کو ہمیشہ اپنے اعمال سے ثابت کرتے چلے آئے اور مذہب کے نہ ماننے والے بھی اس کے مقابل پر ایک ہی نعرہ رکھتے رہے کہ ظلم اور جبر کے ساتھ اِس فتنۂ ارتداد کو بند کر دو۔ اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے طریق پر عمل کرتے رہے یعنی ظلم اور جبر اور تشدد کے ساتھ عملاً انہوں نے مذاہب کو دبانے کی کوشش کی۔

اسی مضمون کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے خدا تعالیٰ نے ایک اور جگہ یعنی سورۂ یونس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے

---

[1] زمر ع ۲ — [2] الکافرون ۶

فرمایا وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا۔ اگر تیرا رب چاہتا تو اس کو جبر کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو مالک ہے، خالق ہے، کامل اختیار رکھتا ہے اپنی تخلیق پر۔ اگر وہ چاہتا لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا سطح ارض پر ہر طرف ہر جگہ کے رہنے والے ایک دن میں ایک ہی آن میں ایمان لے آتے تو یہ ہو کس طرح سکتا ہے کہ ایسا کامل قدرتوں کا حامل خدا تلوار کے زور سے کسی کو مومن بنانے کی کوشش کرے؟ اگر اس کی تقدیر کا تقاضا یہی ہو کہ سب نے خواہ اُن کی مرضی ہو یا نہ ہو ایمان ضرور لانا ہے، خواہ اُن کے دل ٹیڑھے ہوں یا سیدھے انہوں نے اسلام کو ضرور قبول کرنا ہے تو اس کا ایک حکم ہی کافی تھا اور بندے اس کی اطاعت کرتے۔ مگر خدا تعالیٰ کی کتاب ازلی میں یہ مقدر نہیں۔ نہ ہی یہ اُس کی وسیع تر حکمتوں کے مطابق ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○ (سورۃ یونس ع) کہ کیا تُو لوگوں کو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ ایمان لے آئیں؟ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ حالانکہ صورت یہ ہے کہ کوئی شخص بھی ایمان نہیں لا سکتا مگر اُس وقت جبکہ خدا کا اِذن ہو جائے۔ یعنی صرف وہی لوگ ایمان لائیں گے جن کے متعلق خدا کا یہ فیصلہ ہو کہ یہ اس لائق ہیں کہ انہیں ایمان کی نعمت سے متمتع کیا جائے۔ مگر سخت حسرت اور افسوس کا مقام ہے کہ باوجود اس کے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء بغیر استثناء کے سارے کے سارے

مذہبی آزادی کی تعلیم دیتے رہے اور اپنے اعمال سے اور اپنی زندگیوں سے یہ ثابت کر دکھایا کہ سچے مذہب کے نام لیوا مظلوم بن کر زندہ رہا کرتے ہیں ظالم بن کر نہیں۔ اور مذاہب اخلاق سے دلوں کو فتح کیا کرتے ہیں تلوار کے زور سے نہیں۔ مگر بعد کے آنے والے بڑے بڑے جبّہ پوشوں نے جو مذہبی علماء یا پیر فقیر کہلاتے تھے۔ کہیں وہ راہب کا نام استعمال کرتے تھے، کہیں پادری کا۔ کہیں انہیں منتری کہا جاتا تھا کہیں ہنت۔ مذہب کے ان اجارہ داروں نے جو درحقیقت مذہب کی رُوح سے کلیتہً ناآشنا تھے اپنے مظلوم انبیاء کا نام لے لے کر اُن کی ناموس کی خاطر ایسے ایسے مظالم دنیا میں ڈھائے کہ انسانیت اُن کو دیکھ کر سرنگوں ہو جاتی ہے۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ظہور سے پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا اور آپ کے ظہور کے بعد بھی ایسا ہی ہوا۔ اور آج تک ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ آج سے چند سو سال پہلے عیسائیت نے یا یوں کہنا چاہیئے کہ بگڑی ہوئی عیسائیت کے بگڑے ہوئے علمبرداروں نے، بڑے بڑے پادریوں نے اور بڑے بڑے بشپس اور کارڈینلز نے مذہب کے نام پر عیسائی دنیا میں جو ظلم کئے ہیں وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں اور اِس دَور میں انسانوں کو دُکھ دینے کے جو جو طریقے عیسائی مذہب کے علمبرداروں نے ایجاد کئے وہ اتنے خوفناک ہیں کہ ان کو معلوم کرنے کے بعد انسان ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ کیا

انسانیت ذلت کی ایسی اتھاہ گہرائیوں تک بھی گر سکتی ہے؟ کیا دل سختی میں اتنے بھی بڑھ سکتے تھے کہ ہیرے کی کنیوں سے زیادہ سخت ہو جائیں۔ لیکن ایسا ہی ہوا اور خود عیسائی مؤرخین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عیسائیت کے نام پر جو مظالم بعض مظلوم بندوں پر ڈھائے گئے انسانیت ان کے تصور سے شرماتی ہے۔

انگلستان میں مجھے خود ان ظلم کے آلات میں سے بعض کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لندن میں ایک نمائش ہے جس کا نام ہے میڈیم ٹوسو (Madame Toussaud) یعنی مسز ٹوسو کی بنائی ہوئی چیزوں کی نمائش۔ وہاں ایک فرانسیسی خاتون مادام ٹوسو نے دنیا کے بڑے بڑے نیک آدمیوں کے بت بھی بنا کر رکھے ہوئے ہیں اور بد آدمیوں کے بھی۔ یہ بت ایسی عمدگی سے بنائے ہوئے ہیں کہ بالکل زندہ انسانوں کے مشابہ نظر آتے ہیں اور بعض دفعہ یہ دھوکا لگ جاتا ہے کہ بت نہیں ہیں بلکہ انسان ہیں۔ چنانچہ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی اجنبی کسی سپاہی کو کھڑے ہوئے دیکھ کر اس سے رستہ پوچھنے کے لئے بڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ زندہ سپاہی نہیں بلکہ سپاہی کا بت تھا۔ چنانچہ بڑے بڑے نیک کام کرنے والوں یا مشہور لوگوں کے بت بھی وہاں موجود ہیں اور بڑے بڑے سفاک اور ظالم انسانوں اور بدنام مجرموں کے بت بھی وہاں موجود ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ ان ظالموں کے آلاتِ ظلم کو بھی اپنی اصلی صورت میں اکٹھا کر کے رکھا گیا ہے۔ چنانچہ وہ اصل مشینیں بھی وہاں موجود ہیں جن کے

ذریعہ علیسائیت کے علمبردار بعض لوگوں کو ارتداد کی سزائیں دُکھ دیا کرتے تھے یا ارتداد کے جُرم کا اقبال کروانے کے لئے مظالم ڈھایا کرتے تھے تاکہ اُن ظلموں اور دُکھوں سے تنگ آکر وہ لوگ اپنے جُرم ارتداد کو تسلیم کرلیں۔ وہ مظالم اتنے خوفناک تھے کہ بلا استثناء لوگ یا تو اِن ظلموں کی حد سے بڑھی ہوئی اذیت سے سِسک سِسک کر وہیں جان دے دیا کرتے تھے اور یا پھر اپنے جُرم کے اقبال ہی کو غنیمت جانتے تھے۔ وہ یہ بہتر سمجھتے تھے کہ انہیں زندہ آگ میں جلا دیا جائے بہ نسبت اس کے کہ سپین کی انکوئیزیشن یا فرانس کی انکوئیزیشن کے ہاتھوں میں وہ ناقابلِ برداشت ظلم سہہ سہہ کر جان دے دیں۔
اِن مشینوں میں سے جو لنڈن کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی ہیں بعض ایسی ہیں جنکے اُوپر پردہ پڑا ہوُا ہے اور یہ لکھا ہوُا ہے کہ عورتیں اور بچے اِن کو نہ دیکھیں۔ یعنی وہ ظلم کے طریقے اتنے خوفناک ہیں کہ منتظمین کے نزدیک عورتوں اور بچوں کا اُن کو دیکھنا بھی ایک ناقابلِ برداشت امر ہے اور اُن کی طبیعت پر نہایت گہرا اور مہلک اثر چھوڑنے کا موجب بن سکتا ہے۔

مَیں نے خود اپنی آنکھوں سے اُن مشینوں کو دیکھا اور مَیں نے سوچا کہ انسان بھی خدا تعالیٰ کی کیسی حیرت انگیز تخلیق ہے کہ ترقی اور تنزّل دونوں میں انتہاء تک پہنچ جاتا ہے۔ ایک طرف تو جب بلند پروازی اختیار کرتا ہے تو نبوت کے زینے پر قدم رکھ دیتا ہے اور اپنے آقا، خالق اور مالک سے

ہمکلام ہو جاتا ہے۔ اور دوسری طرف جب وہ گرتا ہے تو بگڑے ہوئے مذہبی جُبّہ پوش علماء کی صورت میں دنیا پر ایک لعنت بن کر گرتا ہے۔ ایک طرف مجھے اُس مظلوم مسیح کی تصویر نظر آئی جو صلیب کی خوفناک اذیتوں سے کراہتے ہوئے اِیْلِیْ اِیْلِیْ لِمَا سَبَقْتَانِیْ کی دردناک آواز بلند کر رہے تھے۔ انہوں نے صرف اِس جُرم کی سزا میں صلیب کی اذیتیں برداشت کیں کہ اُن کی قوم کے نزدیک وہ ارتداد اختیار کر چکے تھے۔ دوسری طرف وہ سفّاک عیسائی جُبّہ پوش مذہبی رہنما مجھے نظر آئے کہ جنہوں نے اسی مظلوم کے نام پر بے کس اور بے اختیار انسانوں پر اسی ارتداد کے جُرم میں ایسے ایسے خوفناک مظالم ڈھائے کہ صلیب کا ظلم بھی اُن ظلموں کے سامنے بے حقیقت ہو کر رہ جاتا ہے۔ مَیں نے سوچا کہ کیا اسلام کے اِس اعلانِ عام کے بعد کہ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ اے بنی نوع انسان خوش ہو جاؤ کہ اسلام ہمیشہ ہمیش کے لئے امن کا اعلان کرتا ہے اور مذہبی ظلم و تشدّد کا ہمیشہ ہمیش کے لئے قلع قمع کرتا ہے۔ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔ دین میں کوئی جبر نہیں، دین کے نام پر دُکھ دینا حرام ہے۔ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ اسلام کا تو یہ حال ہے کہ یہ ایک تیز روشنی کا سورج ہے جو ظاہر ہو چکا۔ یہ ایک ہدایت ہے جو بالکل واضح ہو گئی۔ کیا پھر مَیں نے سوچا کہ اس واضح اور غیر مبہم امن کے اعلان کے بعد بھی کسی مسلمان کے ذہن میں یہ تصوّر آ سکتا ہے کہ اسلام مذہب کے

نام پر جبر کو روا رکھتا ہے تو میری نظر اس زمانے کے علماء کی طرف اُٹھی اور شرم سے جُھک گئی اور میرا دل درد سے بھر گیا کہ آج اِس زمانہ میں بھی ایسے مذہبی رہنما موجود ہیں جو اُس رَحۡمَةٌ لِّلۡعَالَمِیۡنَ کی طرف منسوب ہوتے ہیں جس نے عمر بھر دنیا کو امن اور صلح اور حلم اور بُردباری اور رحمت اور شفقت کے درس دیئے اور سخت مظلومی کی زندگی گزاری مگر اُن راہنماؤں کے دل ظلم سے خالی نہیں ہیں اور سینوں میں غیظ و غضب کے سمندر موجزن ہیں اور مذہب کے نام پر سختی اور تشدّد کو روا رکھنا اُن کے عقائد میں داخل ہو چکا ہے۔

وہ اُسی آسمانی پانی کا واسطہ دے کر جو دلوں کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے آیا تھا بے علم عوام کے سینوں میں غیظ و غضب کی آگ بھڑکا دیتے ہیں۔ وہ اسی امن کے شہزادہ کا نام لے لے کر جس نے عرب کی خونی سرزمین سے اپنے خون کی قربانیاں دے کر قتلِ ناحق کو یکسر مٹا ڈالا تھا اُسی کے ماننے والوں کو بے کسوں کے قتل پر آمادہ کرتے ہیں۔ وہ اُسی امین کی محبت کو انگیخت کر کے جس کے گھر غارت گروں نے لُوٹ لئے دنیا کو غارت گری کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ جس نے غیروں اور بدکرداروں کی بیبیوں کی عصمت کی بھی حفاظت کی۔ ہاں وہ سب حیا داروں سے زیادہ حیادار جو بے حیائی کو یکسر نابود کرنے کے لئے آیا تھا آج اُسی عصمتِ مجسّم کی ناموس کے نام پر سالہاسال

کی بیا ہتا عورتوں کو اپنے خاوندوں پر حرام اور غیروں پر حلال کر دیتے ہیں۔
وہ عابدوں کا سردار جس نے باطل مذاہب کے معبدوں کی بھی حفاظت کی
آج اِن مذہبی راہنماؤں نے خود اُسی کا کلمہ پڑھنے والے عابدین کے ایک
گروہ کی مسجدوں کے انہدام کے فتوے دیئے۔ اور یہ سب ظلم جسے وہ پاک
نبیوں کا سردار مٹانے کے لئے آیا تھا خود اُسی مظلوم نبی کے نام پر کئے جانے
لگے۔ کیا کوئی بھی مسلمان یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ اگر آج ہمارا آقا ہم میں موجود
ہوتا (خدا کی بے شمار رحمتیں اور درود ہوں اُس محسن پر) تو وہ اپنی اُمت
کے اِس حال کو دیکھ کر خوش ہوتا؟ نہیں نہیں۔ ایسا مت خیال کرو
کیونکہ یہ اُس حُسن و احسان کے مجسّمہ کی توہین ہے۔ کیا کوئی بھی مسلمان یہ وہم
دل میں لا سکتا ہے کہ وہ اپنی اُمّت کے علماء کو سٹیجوں پر کھڑے ہو ہو کر
ایک دوسرے کے بزرگوں کی تذلیل اور توہین کی تلقین کرتا اور انہیں
کہتا کہ ہاں اور گالیاں دو۔ گندے بہتان لگاؤ اور الزام تراشو اور پردہ دار
مقدس بیبیوں کے نام لے لے کر ایسی مغلظات بکو کہ ایک لا مذہب بھی اُن
کے ذکر سے شرمانے لگے۔ کیا کوئی بھی مسلمان یہ وہم دل میں لا سکتا ہے کہ وہ
سلامتی کا شہزادہ اپنے علماء کو ایسے ہیجان آمیز خطبات دینے کی تلقین کرتا کہ
جس سے بستیوں کا امن اُٹھ جائے اور ایسی شعلہ نوائیوں کا حکم دیتا کہ جس
سے بے کسوں اور کمزوروں کے گھروں اور اموال کو خود اُن کے سمیت

نذرِ آتش کر دیا جاتا اور کہتا کہ ابھی بس نہ کرو اور مرتدین کی مسجدوں کو مسمار کر دو جن کے اسلام کا کوئی جزو تمہارے اسلام سے مختلف ہے اور ان کے مَردوں کو بھی قتل کر دو اور اُن کی عورتوں کو بھی۔ کیونکہ فتنۂ ارتداد کو مٹانے کا بس یہی ایک رُوحانی طریق ہے۔

خدارا اپنے دلوں کو ٹٹولو اور جواب دو کہ کیا کوئی بھی مسلمان ایک لمحہ کے لئے یہ تصور کر سکتا ہے؟ نہیں اور یقیناً نہیں۔ مجھے اُس خدا کی قسم ہے کہ جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اور مکّہ کی گلیوں کی ایک ایک اینٹ گواہ ہے جن پر مظلوم غلاموں کو ارتداد کی سزا میں مرے ہوئے جانوروں کی طرح گھسیٹا گیا تھا۔ اور صحرائے عرب کی ریت کے سُلگتے ہوئے ذرّے گواہ ہیں اور وہ جُھلستی ہوئی پتھر کی سلیں گواہ ہیں جنہیں اُن بے کسوں کی چھاتیوں پر رکھا جاتا تھا کہ یہ اطوار سیّدِ وُلدِ آدمؑ کے اطوار نہیں اور یہ اخلاق اُس مقدس رسولؐ کے اخلاق نہیں۔ اور مجھے قسم ہے اُس خدا کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اور طائف کی سنگلاخ زمین کا ایک ایک پتھر گواہ ہے جس پر سیّدِ وُلدِ آدمؑ کا خون ٹپکا تھا کہ میرے مظلوم آقا نے کبھی مذہب کے نام پر جبر کی تعلیم نہیں دی۔ عفّت کے نام پر عصمتوں کے لُٹنے کا حکم نہیں دیا اور عبادت کی آڑ میں معبدوں کو مسمار کرنے پر انگیخت نہیں کیا۔ پھر کیوں نہ میری آنکھ شرم سے جُھک جائے اور کیوں نہ میرا دل درد سے بھر جائے کہ اُسی مقدس ذات

کی طرف منسوب ہونے والے آج بھی ایسے راہنما موجود ہیں ؛

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝

(الحج ع۶)

اشاعتِ اسلام کے دو نظریئے!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کے اشاعتِ اسلام کے طریق کے بارہ میں دنیا میں دو نظریات پائے جاتے ہیں :۔

۱۔ معاندینِ اسلام کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگیں جارحانہ جنگیں تھیں اور اسلام تلوار کے زور سے پھیلا

مگر

۲۔ غیر جانبدار تحقیق یہ ہے کہ :۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اشاعتِ اسلام کی غرض سے تلوار نہیں اٹھائی اور آپؐ کی تمام جنگیں مدافعانہ جنگیں تھیں اسلام پھیلا ہے تو محض آپؐ کی روحانی اور اخلاقی قوتوں سے !

اشاعتِ اسلام کے بارے میں مولانا مودودیؒ

اور

بعض غیروں کے نظریات

ظلم کی حد یہ ہے کہ بعض مسلمان "رہنما" جبر و تشدد کے نظریہ کو صرف اپنے تک ہی محدود نہیں رکھتے بلکہ ہمارے پاک آقا کو بھی اُس میں ملوث کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اُس کے دین اور اُس کی قوتِ قدسیہ کو بھی اپنے کھوکھلے دلائل اور کرم خوردہ قوتوں کی طرح ایسا کمزور جانتے ہیں کہ گویا اگر تلوار اُس کے قبضۂ قدرت میں نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی وہ عظیم روحانی تبدیلی پیدا نہ کرسکتا جو عرب

سے پھُوٹنے والے اُس روحانیت کے سرچشمہ نے چند سالوں میں کر کے دکھادی تھی۔ اور اُن کے نزدیک اُس مظلوم نبیؐ کی دفاعی جنگیں محض اپنے مذہب کو پھیلانے کے لئے ایک جارحانہ اقدام تھا اور اُس کی مکی زندگی کا دَور محض ایک ناطاقتی کی دلیل تھا۔ چنانچہ جماعتِ اسلامی کے امیر مولانا مودودی نہایت واشگاف الفاظ میں رقمطراز ہیں:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۳ برس تک عرب کو اسلام کی دعوت دیتے رہے وعظ و تلقین کا جو مؤثر سے مؤثر انداز ہو سکتا تھا اسے اختیار کیا، مضبوط دلائل دیئے، واضح حجتیں پیش کیں، فصاحت و بلاغت اور زورِ خطابت سے دلوں کو گرمایا۔ اللہ کی جانب سے محیّر العقول معجزے دکھائے۔ اپنے اخلاق اور پاک زندگی سے نیکی کا بہترین نمونہ پیش کیا اور کوئی ذریعہ ایسا نہ چھوڑا جو حق کے اظہار و اثبات کے لئے مفید ہو سکتا تھا لیکن آپ کی قوم نے آفتاب کی طرح آپ کی صداقت کے روشن ہو جانے کے باوجود آپ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا ....

....

.... لیکن جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعیٔ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی .... تو دلوں سے رفتہ رفتہ بدی و شرارت کا زنگ چھُوٹنے لگا، طبیعتوں سے فاسد مادے خود بخود نکل گئے۔ رُوحوں کی کثافتیں دُور ہو گئیں اور صرف یہی نہیں کہ آنکھوں سے پردہ ہٹ کر حق کا نور صاف عیاں ہو گیا۔ بلکہ گردنوں میں وہ سختی اور سروں میں وہ نخوت بھی باقی نہیں رہی جو ظہورِ حق کے بعد انسان کو اس کے آگے جھُکنے سے باز رکھتی ہے۔

عرب کی طرح دوسرے ممالک نے بھی جو اسلام کو اس سرعت سے قبول کیا کہ ایک صدی کے اندر چوتھائی دنیا مسلمان ہوگئی تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اسلام کی تلوار نے ان پردوں کو چاک کر دیا جو دلوں پر پڑے ہوئے تھے"۔
(الجہاد فی الاسلام صفحہ ۱۳۷ - ۱۳۸)

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ یعنی وہ گندہ اور سخت بہیمانہ الزام جو اسلام کے اشد ترین متعصب دشمنوں کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ذات پر لگایا جاتا تھا جسے یورپ کے یاوہ گو مستشرقین گزشتہ صدی تک عیسائی دنیا میں اُچھالتے رہے اور اسلام سے دلوں کو متنفر کرتے رہے وہ آج خود ایک مسلمان "راہنما" کی طرف سے اس مقدس رسول کی پاک ذات پر لگایا جا رہا ہے ایک ایسے راہنما کی طرف سے جسے "مزاج شناسِ رسولؐ" ہونے کا دعویٰ ہے۔ گو الفاظ کو میٹھا بنانے کی کوشش کی گئی ہے، گو تلوار کی اِس مزعومہ فتح کو پُر شوکت بنا کر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے مگر گولی وہی کڑوی اور ناپاک اور زہریلی گولی ہے جو اسلام کے دشمنوں کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھینکی جاتی تھی۔ یہ وہی پتھر ہے جو اس سے پہلے جارج سیل اور سمتھ اور ڈوزی نے آنحضرت پر پھینکا تھا اور وہی الزام ہے جو مسٹر گاندھی نے آنحضورؐ پر اُس وقت لگایا تھا جب وہ اسلام کی تعلیم سے ابھی پُوری طرح آشنا نہیں تھے۔ اور محض دشمنانِ اسلام کی کہی ہوئی باتوں کو سُن کر یہ تاثر قائم کر لیا تھا۔ چنانچہ

مسٹر گاندھی کے الفاظ میں :۔

"اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا جس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے۔"

اور ڈوزی کہتا ہے کہ :۔

"محمدؐ کے جرنیل ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن لے کر تلقین کرتے تھے۔"

اور سمتھ کا دعویٰ ہے کہ جرنیلوں کا کیا سوال خود

"آپؐ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن لیکر مختلف اقوام کے پاس جاتے ہیں۔"

اور جارج سیل یہ فیصلہ دیتا ہے کہ :۔

"جب آپؐ کی جمعیت بڑھ گئی تو آپؐ نے دعویٰ کیا کہ مجھے ان پر حملہ کرنے اور بزورِ شمشیر بت پرستی مٹا کر دینِ حق قائم کرنے کی اجازت منجانب اللہ مل گئی ہے۔"

ان سب دشمنانِ اسلام کی آوازوں کو سنیئے اور پھر مولانا مودودی کی مندرجہ بالا عبارت کا مطالعہ کیجئے۔ کیا یہ بعینہٖ وہی الزام نہیں جو اس سے پہلے بیسیوں دشمنانِ اسلام نے رسولِ معصومؐ کی ذات پر لگایا تھا، بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک اور اس سے بھی زیادہ آپؐ کی قوتِ قدسیہ

پر حملہ کرنے والا۔ آپ دشمنانِ اسلام کی عبارتیں پڑھ کر دیکھ لیجئے کہیں بھی آپ کو آنحضرتؐ کی قوّتِ قدسیہ کی مزعومہ کمزوری اور معجزات کی ناطاقتی کا ایسا ہولناک نقشہ نظر نہیں آئے گا جیسا مولانا مودودی کے الفاظ میں ۔ یعنی آپؐ کی مسلسل تیرہ سال کی دعوتِ اسلام تو دلوں کو فتح کرنے سے قاصر رہی مگر تلوار اور جبروت نے دلوں کو فتح کر لیا۔ وعظ و تلقین کے مؤثر سے مؤثر انداز تو صحرائی ہواؤں کی نذر ہو گئے مگر نیزوں کی اَنی نے دلوں کی گہرائیوں تک اسلام کو پہنچا دیا۔ آپؐ کے "مضبوط دلائل" تو عقلِ انسانی میں جاگزیں نہ ہو سکے مگر گرزوں کی مار خود دل کو توڑ کر اُن کی عقلوں کو قائل کر گئی۔ واضح بحثیں اُن کی قوتِ استدلال کو متاثر نہ کر سکیں مگر گھوڑوں کی ٹاپوں نے ان کو اسلام کی صداقتوں کے تمام راز سمجھا دیئے۔ فصاحت بلاغت بے کار گئی اور زورِ خطابت دلوں کو اِس درجہ گرما نہ سکا کہ اسلام کا نور اُن کے دلوں میں چمک اُٹھتا۔ حتّٰی کہ خود عرش کے خدا کی طرف سے ظاہر ہونے والے محیّر العقول معجزے بُری طرح خائب و خاسر رہے اور ایک ادنیٰ سی پاک تبدیلی بھی پیدا نہ کر سکے لیکن ...

....."جب داعیٔ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی ....

.........."اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ کس قدر مضحکہ خیز ہے یہ تصور اور کیسے تحقیر آمیز الفاظ ہیں کہ جن کو پڑھ کر رونا آتا

ہے کہ یہ ایک "اسلامی راہنما" کے قلم سے نکلے ہیں جو رسولؐ کی محبت کا دعویدار ہے۔ مولانا کے اِن الفاظ کو پڑھیئے اور "میزان الحق" کے کینہ دوز مصنف پادری فنڈر کے اِن الفاظ کا مطالعہ کیجئے:۔

"اب حضرت محمدؐ تیرہ سال تک نرمی و مہربانی کے وسائل سے اپنے دین کی اشاعت میں کوشش کر چکے تھے ....

.... لہٰذا اب سے آنحضرت "اَلنَّبِیّ بِالسَّیْف" کہلائے یعنی نبیٔ تیغ زن بن گئے اور اس وقت سے اسلام کی مضبوط ترین و کارگر دلیل تلوار ہی قرار پائی۔"[۱]

"اگر ہم حضرت محمدؐ اور اُن کے تابعین کے چال چلن پر غور کریں تو ایسا معلوم ہوگا کہ اب وہ خیال کرنے لگ گئے تھے کہ عقبہ کے موضوع و مقبول اخلاقی قواعد کی پابندی اُن کیلئے ضروری نہ تھی۔ اب خدا اُن سے فقط یہی ایک بات طلب کرتا تھا کہ اللہ کی راہ میں لڑیں اور تیغ و تیر اور خنجر و شمشیر سے قتل پہ قتل کرتے رہیں۔"[۲]

اور اس کے بعد یہ مصنف مسیح کی مظلومی کا بڑے فخر سے نعوذ باللہ

---

[۱] "میزان الحق" صفحہ ۴۲۶ ، [۲] "میزان الحق" صفحہ ۴۶۹ +

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزعومہ جبر کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"آپ کو خداوند یسوع مسیح کلمۃ اللہ اور حضرت محمدؐ بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ۔ راقم) میں سے ایک کو پسند کرنا ہے ۔ یا تو اُس کو پسند کرنا ہے جو نیکی کرتا پھرا یا اُس کو جو "النبی بالسیف" کہلاتا ہے[1]۔"

پھر مولانا مودودی کی تائید میں ایک اور اسلام دشمن مسٹر ہنری کوپی کے مندرجہ ذیل الفاظ پڑھیے :۔

".... اور اپنی نبوت کے تیرھویں سال آپ نے اِس امر کا اظہار کیا کہ خدا نے مجھ کو نہ صرف بغرضِ مدافعت جنگ کرنے کی اجازت دی ہے بلکہ اپنا دین بزورِ شمشیر پھیلانے کی بھی اجازت دی ہے[2]۔"

اور ڈاکٹر اے ۔ سپرنگر کے یہ الفاظ پڑھیے جو مولانا مودودی کی ہم خیالی میں اِس رائے کا اظہار کرتے ہیں :۔

---

[1] تتمہ "میزان الحق"۔ [2] اہلِ عرب کی سپین کی تاریخ از ہنری کوپی جلد اول صفحہ ۳۹۔ مطبوعہ بوسٹن ۔ ماخوذ از "مقدمہ تحقیق الجہاد" صفحہ ۲۱ ؎

"اب پیغمبر (صلعم) نے فتنہ کے دفع کرنے کیلئے اپنے دشمنوں سے جنگ کرنے کا قانون خدا کے نام سے شائع کیا اور اس وقت سے یہ قاعدہ آپ کے (نعوذ باللہ) خونی مذہب کا نعرۂ جنگ ہو گیا[۱]"

کچھ تعجب نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مذہب کے معاملہ میں جبر کا الزام لگانے والے سارے کے سارے وہ ہیں جو آپ کے اشد ترین دشمن ہیں اور بغض و عناد اُن کے سینوں میں کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوُا ہے۔ مگر تعجّب پر تعجب ہے کہ اس معصوم اور مظلوم رسولؐ کی پیروی کا دم بھر کر بھی کوئی کیونکر آپ کی مقدس ذات پر ایسے ہولناک وحشت اور بربریت کے الزام لگا سکتا ہے۔

لیکن حیف ہے کہ مولانا مودودی کے نزدیک نہ کبھی پہلے اسلام میں یہ طاقت تھی کہ محض اپنے حُسن و جمال سے تلوار کی مدد کے بغیر دلوں کو فتح کر سکے۔ اور نہ آج یہ طاقت ہے۔ چنانچہ اپنے رسالہ "حقیقت الجہاد" میں رقمطراز ہیں:۔

"کوئی ایک مملکت بھی اپنے اصول و مسلک کے مطابق پوری

---

[۱] ماخوذ از "مقدمہ تحقیق الجہاد" بحوالہ تاریخ محمدی صفحہ ۲۰۷ مطبوعہ الہ آباد سنہ ۱۸۵۱ء

طرح عمل نہیں کر سکتی جب تک کہ ہمسایہ ملک میں بھی وہی اصول و مسلک نہ رائج ہو جائے۔ لہذا مسلم پارٹی کے لئے اصلاحِ عمومی اور تحفّظِ خودی دونوں کی خاطر یہ ناگزیر ہے کہ کسی ایک خطّہ میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنے پر اکتفاء نہ کرے بلکہ جہاں تک اس کی قوتیں ساتھ دیں اس نظام کو تمام اطراف میں وسیع کرنے کی کوشش کرے۔ وہ ایک طرف اپنے افکار و نظریات کو دنیا میں پھیلائے گی اور تمام ممالک کے باشندوں کو دعوت دے گی کہ اس مسلک کو قبول کریں جس میں اُن کے لئے حقیقی فلاح مضمر ہے۔ دوسری طرف اگر اس میں طاقت ہوگی وہ لڑ کر غیر اسلامی حکومتوں کو مٹا دے گی اور اُن کی جگہ اسلامی حکومت قائم کرے گی۔"

اس عبارت کو جناب مولانا صاحب کی پہلی عبارت کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے بے اختیار گاندھی جی کی یہ رائے ذہن میں اُبھر آتی ہے کہ :-

"اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا ہے کہ اُس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے۔"

اور آنحضرت ؐ کی اُس مصنوعی خیالی تصویر کی طرف دھیان منتقل ہو جاتا ہے جو واشنگٹن اِرونگ نے اپنی مصنفہ "سیرتِ محمدؐ" (صلی اللہ علیہ وسلم) سے

پہلے ہی صفحہ پر چسپاں کی ہے اور جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ہاتھ میں تلوار لیئے اور ایک ہاتھ میں قرآن لئے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

اور معاً دل میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ مولانا کے نزدیک بھی اسلام اور اس کے مقدس رسولؐ کا تصور واشنگٹن ارونگ کے تصور سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

پس ایک طرف تو یہ مسلمان "عالم" ہے کہ دنیا کے معصوم ترین نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اشد ترین مخالفین کا ہم نوا ہو کر ظلم اور تعدی اور جبر اور بغاوت کے الزام لگا رہا ہے اور دوسری طرف ہمیں بے شمار ایسے انصاف پسند غیر مسلم مفکرین کا گروہ نظر آتا ہے۔ جو باوجود شدید اختلافات کے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہرگز تلوار کے زور سے نہیں پھیلا بلکہ اپنے ظاہر و باطن حسن اور عظیم اخلاقی قوت کے زور سے دلوں پر فتحیاب ہوا۔ چنانچہ مولانا اور معاندین اسلام کے محررہ بالا اقتباسات کے بعد بے محل نہ ہو گا کہ ہم بعض انصاف پسند غیر مسلموں کی رائے بھی پیش کر دیں۔ یہ سب کے سب اسلام کے حامی و مداح نہیں ہیں بلکہ بعض ایسے بھی ہیں کہ خفیف سے خفیف موقع سے فائدہ اٹھا کر بھی اسلام پر حملہ کرنے سے نہیں چوکے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دفاعی جنگوں پر گہری تنقیدی نظر ڈالنے کے بعد انہیں بے اختیار یہ تسلیم کرنا پڑا کہ:۔

"اکثر متعصب مخالفینِ اسلام خصوصاً گمراہ کن پروپیگنڈا کرنے اور ملک میں آتشِ فتنہ و فساد کے بھڑکانے والے کہا کرتے ہیں کہ حضرت محمدؐ صاحب مدینہ جا کر طاقت و قوّت حاصل کر کے اپنی اِس بناوٹی تعلیمِ رحم و مروّت کو باقی نہ رکھ سکے بلکہ اپنی زندگی کے اہم مقصود (طلبِ دنیا، حکومت و مرتبہ، مال و دولت وغیرہ) کے حصول کے لئے بڑے زور کے ساتھ تلوار و قوّت کا استعمال کیا۔ بلکہ ایک خونی پیغمبر بن کر دنیا میں تباہی و بربادی مچائی اور اپنے اس بناوٹی صبر و ضبط کے معیار سے گر گئے۔ لیکن یہ ان کوتاہ بین مخالفوں کی (جن کو خواہ مخواہ کا بغض اسلام اور مسلمانوں سے ہے) تنگ نظری اور بچپا تشت روپی اگیان کا پردہ جو اُن کی نگاہوں پر پڑا ہوا ہے اور بجائے نور کے نار، حُسن کے قبح۔ اچھائی کے بُرائی ہی تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اور ہر ایک خوبی کے اعلیٰ مرتبہ و تعلیم کو ایسی بھدی شکل و صورت میں پیش کرتے ہیں جن سے ان کی بدباطنی اور سیاہ قلبی کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔"[1]

---

[1] دنیا کا ہادیٔ اعظم "غیروں کی نظر میں" صفحہ ۵۷ +

یہ اقتباس ایک غیر مسلم مقرر جناب پنڈت گیا نیندر صاحب دیو شرما شاستری کی ایک تقریر سے لیا گیا ہے جو انہوں نے ۱۹۲۸ء میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر گورکھپور میں فرمائی تھی۔ کچھ آگے چل کر یہی پنڈت صاحب اسلام کی فیصلہ کن طاقت کے بارہ میں اپنی تحقیق کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :۔

" مخالفین اندھے ہیں۔ اُن کو نظر نہیں آتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلوار رحم و مروّت تھی۔ دوستی اور درگزر تھی جو مخالفین پر پورے طور پر کارگر ہوتی۔ اور اُن کے قلب کو پاک و صاف کر کے مثل آئینہ بنا دیتی۔ جس کی کاٹ اس مادی تلوار سے بڑی زبردست اور تیز ہوتی تھی۔"

اس اقتباس کے بعد کسی رائے زنی یا موازنہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ مگر دل سے بے اختیار یہ آہ نکل جاتی ہے کہ کاش مولانا مودودی اپنے "آقا" کے بارہ میں اتنے ہی انصاف سے کام لیتے جتنا کرشنؑ کے ایک غلام نے لیا ہے۔ ایک نہیں بلکہ بیسیوں حضرت کرشنؑ کے غلاموں نے جب تاریخ اسلام پر غور کیا تو ہمارے آقاؐ کی قوتِ حسن کو محسوس کیا اور یہ کہے بغیر اُن سے بن نہ پڑی کہ :۔

؎ "دنیا کا ہادیٔ اعظم غیروں کی نظر میں" صفحہ ۶۱ +

"لوگ کہتے ہیں کہ اسلام شمشیر کے زور سے پھیلا مگر ہم اُن کی اس رائے سے موافقت کا اظہار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ زبردستی سے جو چیز پھیلائی جاتی ہے وہ جلدی ظالم سے واپس لے لی جاتی ہے۔ (تعجب ہے کہ مولانا کی نظرِ "مزاج شناسِ نبوت" انسانی فطرت کے اس ظاہر و باہر نکتہ کو بھی پا نہ سکی۔ ناقل) اگر اسلام کی اشاعت ظلم کے ذریعہ ہوئی ہوتی تو آج اسلام کا نام نشان بھی باقی نہ رہتا۔ لیکن نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلام دن بدن ترقی پر ہے۔ کیوں ؟ اس لئے کہ بانیٔ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم۔ ناقل) کے اندر روحانی شکتی تھی۔ منش ماتر (بنی نوع انسان) کے لئے پریم تھا۔ اُس کے اندر محبت اور رحم کا پاک جذبہ کام کر رہا تھا۔ نیک خیالات اُس کی رہنمائی کرتے تھے[۱]۔"

مگر مولانا صاحب پھر بھی مُصر ہیں کہ اسلام کی فیصلہ کن طاقت آپ کی معجزانہ

---

[۱] از قلم ایڈیٹر "ست اُپدیش" لاہور مورخہ ۷ جولائی ۱۹۱۵ء۔ ماخوذ از "برگزیدہ رسول غیروں میں مقبول" صفحہ ۱۲ و ۱۳ +

زندگی میں نہیں بلکہ تلوار میں مضمر تھی۔ حسرت اور پھر حسرت ہے کہ آپؐ کی مقدس زندگی کا وہ معجزہ جو ایک غالی آریہ کی نظر سے بھی اوجھل نہ رہ سکا مولانا کی "پُر بصیرت آنکھ" اُسے دیکھنے سے محروم رہ گئی۔ "آریہ مسافر" کی اسلام دشمنی سے کون واقف نہیں ہے۔ یہ آریہ مذہب کا وہ ترجمان ہے جو ہمیشہ اسلام کی مخالفت پر کمربستہ رہا مگر جب اس کے ایک مقالہ نویس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبہ کی وجوہات پر غور کیا تو تلوار کی قوت کے الزام کو ایک فرسودہ اور بودے اتہام کے طور پر ٹھکرا دیا اور آپ کے غلبہ کی وجہ محض یہ قرار دینے پر مجبور ہو گیا کہ آپ کی زندگی ایک مجسّم معجزہ تھی۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے اور انسانی فطرت کی یہ کیسی سچی اور پاک گواہی ہے کہ:۔

> "وہ شخص جس نے قریش کو ایمان کا جام شہادت پلایا ایک معجزہ تھا...... اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم۔ ناقل) کی زندگی ایک معجزہ نہ ہوتی تو کون ہم کو ولید (غالباً خالد بن ولیدؓ مراد ہیں۔ ناقل) کی بے غرضانہ خدمات سے مستفید کرتا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم۔ ناقل) نے جوشِ ایمان کا دریا موجزن کیا اور عرب کی جنگلی آبادی کو ایک واحد خدا کا پرستار بنایا۔"[1]

---

[1] "آریہ مسافر" اکتوبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۲ و ۳ بحوالہ "برگزیدہ رسولؐ غیروں میں مقبول صفحہ ۴۴"

پھر لاہور میں ہونے والے آریہ سماج کے ایک جلسہ میں پروفیسر رام دیو صاحب سابق پروفیسر گورو کل کانگڑی و ایڈیٹر ویدک میگزین نے ہمارے آقا و مولا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر لگائے جانے والے اس مکروہ اتہام کو غلط قرار دیتے ہوئے کہ آپ نے اسلام تلوار سے پھیلایا تھا ان الفاظ میں اپنی تحقیق کا اظہار کیا :-

"لیکن مدینہ میں بیٹھے ہوئے محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم ناقل) نے اُن میں جادُو کی بجلی بھر دی۔ وہ بجلی جو انسانوں کو دیوتا بنا دیتی ہے .... اور یہ غلط ہے کہ اسلام محض تلوار سے پھیلا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اشاعتِ اسلام کے لئے کبھی تلوار نہیں اٹھائی گئی۔ اگر مذہب تلوار سے پھیل سکتا ہے تو آج کوئی پھیلا کر دکھا دے[1]"

اس آخری فقرہ میں کیسی لازوال سچائی بھری ہوئی ہے "اگر مذہب تلوار سے پھیل سکتا ہے تو آج کوئی پھیلا کر دکھا دے" ہمارے مقدس آقا صلی اللہ علیہ وسلم پر جبر کا الزام لگانے والوں کے لئے لمحۂ فکریہ اور چیلنج ہے۔ اور مجھے قسم ہے اُس ذات کی جس نے مذہب کو پیدا کیا کہ جب سے سلسلۂ

---

[1] اخبار "پرکاش" بحوالہ "برگزیدہ رسول غیروں میں مقبول" صفحہ ۲۴ +

نبوّت جاری ہوا ہے نہ کبھی پہلے کسی جابر متشدّد نے اس چیلنج کا جواب دیا نہ آج دے سکتا ہے نہ کبھی آئندہ دے سکے گا۔ اور ایک مودودی نہیں پچاس کروڑ مودودی بھی مل کر کوشش کریں تب بھی ایک انسان کے دل سے بھی تلوار کی قوّت سے اُس کا مذہب نکال نہیں سکتے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء اِس بات کے گواہ ہیں کہ اُن کے مخالفین کی طرف سے مذہب کو بزور تبدیل کرانے کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار مرتبہ تلوار اٹھائی گئی مگر ہر بار خائب و خاسر رہی۔ وہ ہاتھ شل ہو گئے اور وہ تلواریں ٹوٹ گئیں اور مذہب اُن کے سائے تلے بے خوف پھیلتا اور پھولتا اور پھلتا رہا۔ پھر ان سب نبیوں کے سردارؐ کے کب شایاں تھا کہ اس معصوم گروہ کے کامیاب طریقۂ تبلیغ کو چھوڑ کر ناکام ظالموں کا وطیرہ اختیار کرتے۔ نہیں۔ ایسا مت کہو کہ یہ میرے آقاؐ پر توڑے جانے والے سب ظلموں سے زیادہ ظلم ہے اور ایسا صریح ظلم ہے کہ غیر بھی بے اختیار پکار اُٹھے کہ نہیں ایسا نہیں ہوا۔ چنانچہ موسیو اوجین کلوفل نے آپؐ کے متعلق لکھا:۔

"محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم۔ ناقل) نے تمام دنیا کو فتح کرنا اور اسلام کا بول بالا کرنا چاہا مگر غیر مذاہب والوں پر کسی قسم کا جبر و ستم کرنا روا نہیں رکھا۔ اُن کو مذہب اور رائے کی آزادی عطا کی اور اُن کے تمدّنی حقوق قائم رکھے[1]۔"

---

[1] "اسلام اور علمائے فرنگ" صفحہ ۹ بحوالہ "برگزیدہ رسولؐ غیروں میں مقبول" صا۱۱

مہاتما گاندھی کو بھی جن کی فراست بڑی گہری تھی مزید تحقیق کے بعد آخر اپنی اُس رائے کو تبدیل کرنا پڑا جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے اور اپنے اخبار "ینگ انڈیا" کی ایک اشاعت میں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ :۔

"میں جُوں جُوں اِس حیرت انگیز مذہب کا مطالعہ کرتا ہوں حقیقت مجھ پر آشکارا ہوتی جاتی ہے کہ اسلام کی شوکت تلوار پر مبنی نہیں"۔

اور ڈاکٹر ڈی ۔ ڈبلیو ۔ لائٹز نے بھی خود قرآن ہی سے اِلزام کی تردید میں ایک مضبوط استدلال کرتے ہوئے لکھا :۔

"فی الواقع اُن لوگوں کی تمام دلیلیں گر جاتی ہیں جو محض اس بات پر قائم ہیں کہ جہاد کا مقصد تلوار کے ذریعہ سے اسلام کا پھیلانا تھا۔ کیونکہ بخلاف اِس کے سورۂ حج میں صاف لکھا ہے کہ "جہاد کا مدّعا مسجدوں اور گرجاؤں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں اور زاہدوں اور عابدوں (پیشیروں) کی خانقاہوں (تپسیا شالاؤں) کو بربادی سے محفوظ رکھنا ہے"[۱]۔"

---

[۱] "ایشیاٹک کوارٹرلی ریویو" اکتوبر ۱۸۸۶ء۔

پس تلوار کے زور سے اسلام پھیلانے کا الزام لگانے والوں سے مَیں خود قرآن ہی کے الفاظ میں پوچھتا ہوں :- اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا"؟ ـــــ "کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے ؟ یا دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں"! ـــــ

مگر مولانا کو کون سمجھائے کہ وہ اس دعویٰ پر مُصر ہیں اور بہانگِ دُہل مُصر ہیں اور فنڈر اور سیل اور ہنری کوپی اور سمتھ اور ڈوزی اور سپرنگر کی ہمنوائی میں مُصر ہیں اِس اعلان پر کہ :-

"یہی پالیسی تھی جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے عمل کیا۔ عرب جہاں مسلم پارٹی پیدا ہوئی تھی سب سے پہلے اُسی کو اسلامی حکومت کا زیرِ نگیں کیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف کے ممالک کو اپنے اصول اور مسلک کی طرف دعوت دی۔ مگر اس کا انتظار نہ کیا کہ یہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں بلکہ قوّت حاصل کرتے ہی رومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا۔ آنحضرتؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ پارٹی کے لیڈر ہوئے تو انہوں نے رُوم اور ایران دونوں کی غیر اسلامی حکومتوں پر حملہ کیا اور حضرت عمرؓ نے اِس حملہ کو

کامیابی کے آخری مراحل تک پہنچا دیا۔[1]"

اگر یہ تحریر کسی اشتراکی تواریخ نویس کی ہوتی اور یہ پالیسی مارکس یا لینن یا سٹالن کی طرف منسوب کی جاتی اور "مسلم پارٹی" کی جگہ "کمیونسٹ پارٹی" کے الفاظ ہوتے تو مجھے کچھ تعجب نہ ہوتا اور میں بغیر کسی قلبی ہیجان کے اس عبارت کو پڑھ کر آگے گزر جاتا اور خیال بھی نہ کرتا کہ یہ کسی نے کیا لکھا ہے۔ کاش ایسا ہی ہوتا۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔ اور یہ ایک مسلم راہنما کی تحریر ہے جو واشگاف الفاظ میں اس مقدس ذات پر یہ اتہام لگا رہا ہے جس کی غلامی کا دعویٰ کرتا ہے۔

یہ مولانا مودودی کی تحریر ہے...... الفاظ واضح اور غیر مبہم ہیں۔ الزام سخت گھناؤنا اور ننگا ہے۔ اور صرف ایک الزام نہیں بلکہ الزام پر الزام لگایا گیا ہے۔ اس تحریر کا پڑھنا بھی مجھ پر سخت گراں ہے اور اس کا لکھنا بھی۔ اور ناقابل بیان اذیت پہنچتی ہے جب اس فقرہ پر نظر پڑتی ہے کہ دعوت اسلام تو بھیجی مگر:۔

"اس کا انتظار نہ کیا کہ یہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں بلکہ قوت حاصل کرتے ہی رومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا۔......"

---

[1] "حقیقت جہاد" ص۶۵ ؎

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پالیسی تو ایک معصومانہ پالیسی تھی جو ایک نوزائیدہ بچہ کے دل کی طرح پاک وصاف تھی۔ آپ نے تلوار اُسی وقت اٹھائی جب آپ پر حد سے بڑھ کر مظالم توڑے گئے اور صرف اُسی وقت اٹھائی۔ آپ کے ہاتھ سلامتی کے ہاتھ تھے اور جارحیت کی تلوار سے سراسر ناآشنا تھے۔ شریف النفس غیروں نے بھی جب آپ کی اِس پالیسی پر نگاہ کی تو اُسے کلیتہً سلامتی اور امن اور دفاع کی پالیسی قرار دیا۔ چنانچہ مودودی صاحب کے مندرجہ بالا الفاظ پڑھنے کے بعد اب ایک سکھ معاصر کے الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

"ابتداء میں آنحضرتؐ کے مخالفین نے جب آپ کا جینا اجیرن بنا دیا تو آپ نے اپنے پیروکاروں سے کہا کہ اپنا وطن چھوڑ کر مدینے چلے جاؤ۔ یعنی اپنے کسی ہم وطن بھائی پر ہاتھ اُٹھانے کی بجائے حضورؐ نے اپنا پیارا وطن چھوڑنا منظور کر لیا۔ لیکن آخرکار جب اُن پر ظلم اور جبر کی حد کر دی گئی تو مجبوراً آپ نے اپنی اور اسلام کی حفاظت میں تلوار اٹھائی ......

...... یہ پرچار کہ دین کی اشاعت کے لئے جبر کرنا جائز ہے اُن احمق لوگوں کا عقیدہ ہے جنہیں نہ دین کی سمجھ ہے نہ دنیا کی۔ وہ حقیقی سچائیوں سے دُور

ہونے کی وجہ سے اِس غلط عقیدہ پر فخر کرتے ہیں۔"[۱]

اِس پر مَیں کوئی مزید تبصرہ نہیں کرتا قارئین کا دل خود گواہی دے گا کہ دونوں میں سے کون سچا ہے، ایک سکھ جدیدہ نگار یا "مزاج شناسِ نبوت ؟

---

[۱] "نواں ہندوستان" دہلی۔ اشاعت ۱۷ ۱۱/۶۲ ء

اشاعتِ اسلام پر جبر کا الزام

تاریخی شواہد کی روشنی میں

گزشتہ باب میں مولانا مودودی کا جو اقتباس نقل کیا گیا ہے" (لیکن جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعیٔ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی ۔۔۔۔۔") یہ ان کی کتاب "الجہاد فی الاسلام" سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے انسان بغیر کسی دقت کے اس نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے جس کا فکر اس کے ذاتی رجحانات اور قلبی کیفیات کا تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل ایک منصف اور قاضی کے طور پر عطاء فرمائی ہے جو اس کے جذبات اور علم پر یکساں عدل کو جاری کرتی ہے اور اگر ایک طرف ان دونوں کو ایک دوسرے پر ناجائز دسترس سے باز رکھتی ہے تو دوسری طرف ان کے اندرونی توازن کو بھی قائم کرتی ہے لیکن اگر کسی کی نظر و فکر کا یہ قاضی غلط تربیت کی بناء پر غیر منصف ہو جائے یا آزاد نہ رہ سکے اور خود اپنے ہی جذبات کا غلام ہو کر رہ جائے تو ایسے شخص کی ذہنی دنیا میں

ایک انتشار، لاقانونی اور بدنظمی کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اگر یہ غیر آزاد یا غیر منصف عقل کسی ایسے شخص میں پائی جائے جو جاہلِ مطلق ہو یا جذبات سے بالکل عاری ہو تو انسان کو بحیثیتِ اجتماعی اُس سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ مگر جس قدر بھی ایسے شخص کے پاس علمی مواد زیادہ ہو یا جذبات کی فراوانی ہو اُسی قدر یہ غلط نتائج اخذ کر کے دنیا کے لیے ایک مصیبت اور ابتلاء کا موجب بن سکتا ہے۔ جب یہ قاضی کمزور ہو تو کبھی تو یہ اپنے جذبات کا غلام بن جاتا ہے اور کبھی ظاہری علم کا۔ کبھی تو ایک بھٹکتے ہوئے شاعر یا ایک جنونی کے بھیس میں ظاہر ہوتا ہے، کبھی ایک خشک فلسفی یا ایک روحانیت سے عاری عالم کا روپ دھار لیتا ہے۔ اور ان میں سے ہر صورت بنی نوع انسان کیلئے ایک مصیبت اور خطرہ بن جاتی ہے۔

مولانا مودودی کی بعض کتب مثلاً "الجہاد فی الاسلام" کے مطالعہ سے مَیں نے یہ تأثر قائم کیا ہے کہ اُن کے ہاں عقل کا قاضی آزاد نہیں بلکہ مخصوص ذاتی رجحانات کا تابع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے مہیا شدہ علمی مواد سے جو نتائج اخذ کرتے ہیں وہ سخت مضطرب بلکہ باہم برسرِ پیکار ہیں۔ اسلام کے متعلق مولانا پہلے سے یہ تہیہ کئے بیٹھے ہیں کہ اِس مذہبِ معصوم کو اگر پھیلایا جا سکتا ہے تو تلوار کے زور سے۔ مگر مشکل درمیان میں یہ در پیش ہے کہ اوّل تو قرآن اِس نظریہ کے مخالف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی کا ایک ایک

لحہ اس کے خلاف۔ دوسرے غیروں کی نظر کا کچھ کچھ ڈر کہ وہ کیا کہیں گے کہ "اسلام" ایک ایسا بہیمانہ مذہب ہے۔ چنانچہ مولانا عجیب تذبذب میں مبتلا ہیں کہ جو چاہتے ہیں وہ پوری طرح کہہ نہیں سکتے۔ اور جو کہہ سکتے ہیں وہ دل کی پوری آواز نہیں۔ اسی اُلجھن میں پھنس کر مولانا نے ایک پیچ در پیچ طریق مافی الضمیر کے اظہار کا نکالا ہے۔ زیر بحث کتاب میں ابتداء تو اس دعویٰ سے کرتے ہیں کہ اسلام مذہب میں جبر کو روا نہیں رکھتا مگر انتہا د اس کے بالکل برعکس دعویٰ پر جا کر ہوتی ہے۔ اِس کتاب کے شروع میں سارا زور یہ ثابت کرنے پر صرف کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی جنگیں مدافعانہ جنگیں تھیں اور اُن کی غرض یہ تھی کہ انسان کی آزادیٔ ضمیر کو قائم کیا جائے، جبر و تشدد کے ذریعہ اسلام کو دبانے کے لئے مخالفین کی تمام ناپاک کوششوں کو ناکام بنا دیا جائے اور حق کو اُن کی عائد کردہ قیود سے آزاد کیا جائے۔

ایک قدم آگے

یہ پڑھ کر انسان کا دل خوش ہو جاتا ہے کہ بڑا ہی پاک مذہب ہے جو فطرتِ انسانی کے عین مطابق ایسی آزاد اور پُرامن تعلیم دیتا ہے اور انسان کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنے مذہبی خیالات میں پوری طرح آزاد ہے اور اُس پر دوسرے مذہبی نظریات کو ٹھونسنے کے لئے ہر قسم کا جبر ناجائز ہے لیکن افسوس کہ یہ خوشی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی اور مودودی صاحب یہاں پہنچ کر

پینترا بدلنے لگتے ہیں اور استدلال کا سارا دھارا اِس طرف پھر جاتا ہے کہ کسی طرح اسلام کے ساتھ تشدد کے نظریات کو باندھا جائے۔ آپ یہ پڑھ کر حیران تو ضرور ہوں گے کہ اگر پہلے اِس نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ اسلام کی جنگیں محض خود حفاظتی کی جنگیں تھیں اور مذہب میں جبر کے استعمال کے خلاف ایک عملی احتجاج کے طور پر تھیں تو پھر اُسی سانس میں یہ کہنے کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے کہ اسلام خود مذہب کے نام پر جبر کو روا رکھتا ہے۔ یہ سمجھنا آپ کے اور میرے لیے مشکل ہو تو ہو مگر مودودی صاحب کے لئے مشکل نہیں۔ چنانچہ اِس مقام پر اِس امر کی پُوری تسلی کر لینے کے بعد کہ مخالفینِ اسلام کا مُنہ دنداں شکن جواب دیکر بالکل بند کر دیا گیا ہے، اب اپنوں میں بیٹھ کر دل کی بات کا اظہار شروع کرتے ہیں اور ایک حیرت انگیز قلبِ ماہیت (Transformation) میں سے گزرتے ہوئے قرآن و حدیث کو مَن مانے معنے پہنا کر اور ناقابلِ فہم وجوہاتِ جواز پیش کر کے آخر اِس نتیجہ تک پہنچ ہی جاتے ہیں کہ مسلمان بنانے کے لئے تو جنگ بہرحال جائز نہیں مگر بُری باتوں سے روکنے کے لئے ضرور جائز ہے بلکہ فرض ہے۔

اور چونکہ غیر اسلامی ممالک اور تمدّن میں بُری باتیں ہوتی ہی ہیں اس لئے اسلام یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اپنے ملک میں آپس میں بُری باتیں کرتا رہے۔ اِس جبر کو تو انسانی آزادی میں دخل نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اسلام پھیلانے سے

اس کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ تو محض بُری باتوں سے روکنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔

ایک اور قدم آگے

یہ فرما کر مولانا اپنے ذاتی رجحانات کے بہت قریب آجاتے ہیں مگر ابھی دل کی پوری بات نکلی نہیں۔ بھلا اس میں کیا لطف ہوا کہ کسی کو بزورِ شمشیر بُری باتیں کرنے سے منع کر کے انسان اپنا رستہ پکڑ لے۔ جب ایک دفعہ بُری باتوں سے روکنے کی غرض سے تلوار ہاتھ میں پکڑ ہی بیٹھے تو پھر کیا اسی پر بس کر دیں گے؟ نہیں۔ بلکہ اس کی کوئی اور غرض ہونی چاہیئے اور وہ غرض ڈھونڈنی بھی کچھ مشکل نہیں۔ اگر قرآن کریم کی صرف ایک آیت کو محل سے بے محل کر کے اُسے حسبِ منشاء معانی پہنا دیئے جائیں تو بآسانی ایسا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہی آسان راستہ اختیار کرتے ہوئے مودودی صاحب فرماتے ہیں:-

"حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ میں اس قتال کی غرض و غایت کو اچھی طرح بیان کر دیا گیا ہے (جس قتال کو بری باتوں سے روکنے کی غرض سے شروع کیا گیا تھا۔ ناقل) اگر حَتّٰى يُسْلِمُوا کہا جاتا تو البتہ غایتِ قتل یہ ہوتی کہ اُنہیں تلوار کے زور سے مسلمان بنایا جائے۔ لیکن حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ نے بتا دیا کہ اُن کا ادائے جزیہ پر راضی ہو جانا قتال کی آخری

حد ہے اور اس کے بعد پھر ان کی جان ومال پر کوئی حملہ نہیں
کیا جاسکتا۔ خواہ وہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں[۵]"۔

قارئین اب تک میرے اس تمہیدی بیان کا مطلب بخوبی سمجھ چکے ہوں گے کہ ایک غیر آزاد عقل کو جب علم پر کچھ دسترس حاصل ہو تو وہ دنیا کے سامنے عجیب مضطرب اور مہلک نتائج پیش کرتی ہے۔ تمسخر کی حد ہے کہ ابتداء تو اس بیان سے شروع ہوتی ہے کہ اسلام ایک آزادئ ضمیر کا مذہب ہے اور اسلامی جنگوں کی غرض صرف یہ تھی کہ مخالفین کی طرف سے مذہبی آزادی کو کچلا جارہا تھا۔ وسط میں جاکر یہ نظریہ پیش کیا جاتا ہے کہ در اصل اسلام کے دو حصے ہیں۔ اچھی باتوں کا حکم دینا اور بُری باتوں سے روکنا۔ بزور اچھی باتوں کا حکم دینا تو چونکہ آزادئ ضمیر کے خلاف ہے اس لئے اسلام ایسا نہیں کرتا مگر بُری باتوں کو چونکہ کسی صورت برداشت نہیں کرسکتا اس لئے دنیا کے کونے کونے سے بُری باتوں کو بزور شمشیر مٹانے کے لئے جنگ کا حکم دیتا ہے اور آخر پر نتیجہ اس کا یہ نکلتا ہے کہ چونکہ بُری باتوں کو مٹانے کی غرض سے جنگ کی گئی تھی اس لئے اسلام جزیہ لے کر راضی ہوجاتا ہے اور "پھر اُن کی جان ومال پر کوئی حملہ نہیں کیا جاسکتا خواہ وہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں"۔ یہاں پہنچ کر

---

[۵] "الجہاد فی الاسلام" ص۹۳۔

مولانا کو نصف اسلام یعنی بُری باتوں سے روکنا بھی بالکل بھول جاتا ہے کیونکہ جزیہ مل گیا اور اصل غرض و غایت پوری ہو گئی۔ چنانچہ یہ ذکر کرنا بھی یاد نہیں رہتا کہ اِس جگہ اسلام قبول کرنے یا نہ کرنے سے کیا مراد ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دونوں یا دونوں میں سے ایک۔

آخری چھلانگ

لیکن ابھی تک بھی مولانا اپنے مافی الضمیر کو پُوری طرح ادا نہیں فرما سکے اور ایک آخری چھلانگ لگانی باقی ہے۔ مودودی فکر یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ اشاعتِ اسلام کو تلوار سے کوئی واسطہ نہ ہو اور تشدّد کے بغیر بھی کوئی مذہب دنیا میں پھیل سکے۔ چنانچہ قتال کی غرض و غایت جزیہ حاصل کرنا بیان فرما کر یہ ثابت فرمانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اشاعتِ اسلام کے لئے تلوار بہرحال ناگزیر تھی۔ چنانچہ انگریزی کے اِس محاورہ کے مطابق کہ "بلی بیگ سے باہر نکل آئی" ("Cat is out of the bag") دل کی بات آخر نکل ہی آتی ہے۔ اور مولانا اچانک آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے مقدس نام پر اِس الزام کے ساتھ جست لگاتے ہیں:۔ "لیکن جب معجزات کی ناکامی کے بعد داعیٔ اسلام نے تلوار ہاتھ میں لی ۔ ۔ ۔ ۔" اور معاً وہ سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں جو اب تک سینہ میں دبا پڑا تھا۔ (افسوس کہ اِس مقام سے پہلے اگر مولانا کے قدم تمسخر کی حدود میں اُٹھ رہے تھے تو اِس چھلانگ کے ساتھ ہی صریح ظلم و ستم

کی حد میں داخل ہو جاتے ہیں) اور اپنے مخصوص رنگ میں رات کو دن اور دن کو رات بتاتے ہوئے اشاعتِ دین کے اسی خونی تصور کو عین راستی اور حق دکھاتے ہیں۔ آخری نتیجہ اِن تمام سیاہ کیے ہوئے صفحات کا یہ نکلتا ہے کہ:۔

"جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان بناتا ہے اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کا کوئی حصہ نہیں ہے[۱]۔"

کچھ دیکھا آپ نے کہ کہاں سے چلے تھے اور کہاں جا نکلے۔ کس غرض سے تلوار پکڑی تھی اور کہاں استعمال ہونے لگی؟

مولانا کی اِس ڈپلومیسی کو دیکھ کر خود بخود ذہن اُن ممالک کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو اپنے دفاع کی غرض سے ہتھیار لیکر جارحانہ مہمات میں استعمال کرنے لگتے ہیں۔ مولانا کو اختیار ہے کہ جو چاہیں کریں اور جس طرح چاہیں سوچیں۔ صرف اتنی احتیاط لازم تھی کہ حاسد دشمن کے لئے۔ جو پہلے دن سے ہی اسلام اور داعیٔ اسلامؐ پر بشدت حملہ آور ہے اور موقع کی تلاش میں ہر آن چوکس و ہوشیار ہے خود اپنے ہاتھ سے قلعے کے دروازے نہ کھول دیتے!

اگر مولانا نے قرآن و حدیث کا مطالعہ نہ کیا ہوتا یا اُنہیں تاریخِ اسلام کی

---

[۱] "الجہاد فی الاسلام" ص ۱۳۸۔

کچھ بھی واقفیت نہ ہوتی تو میں اس خیال سے تسلی پا لیتا کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں لاعلمی میں کہہ رہے ہیں۔ مگر افسوس کہ یہ کہنے کی بھی گنجائش باقی نہیں۔ علم سب اپنی جگہ پر ہے اور سب کچھ جان رہے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے کہ تاریخِ اسلام کا ایک ایک ورق، ایک ایک لفظ اس نظریہ کو جھٹلا رہا ہے کہ اشاعتِ اسلام میں تلوار کو کوئی ذرہ بھر بھی دخل تھا، اسی نظریہ پر مُصر ہیں اور ببانگِ دُہل مُصر ہیں اور نہیں بتا سکتے کہ اگر دلوں کے زنگ دھونے کے لئے تلوار ایسی ہی ضروری تھی تو ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ کے دلوں کے زنگ کس تلوار نے دھوئے تھے اور کس تلوار نے بلال حبشیؓ کے دل میں توحید کا نور داخل کیا تھا؟ پھر وہ تلوار کون سی تھی جس نے زید بن حارثؓ اور زبیر بن العوامؓ کو مسلمان کیا؟ اور وہ کون سی تلوار تھی جو حمزہؓ اور طلحہؓ کے دل کو ایمان بخش گئی؟ عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور ابوعبیدہ بن عبداللہؓ، عثمان بن مظعونؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ کے دل کس تلوار کی آب سے مصفّٰی کئے گئے؟ اور وہ سارے مہاجرینؓ اور وہ سارے انصارؓ جن کی تعداد ہزارہا تک جا پہنچتی ہے اور جن کے متعلق خود مولانا کو بھی تسلیم ہوگا کہ اُن کے قبولِ اسلام میں کسی تلوار کے دخل کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا کس طرح تطہیرِ قلوب کے اس ضروری ہتھیار کے بغیر پاک دل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ کس طرح اُن کے زنگ کھرچے گئے اور نیا رنگ چڑھانے کے لئے دل صیقل کئے گئے؟ مولانا! تاریخِ اسلام پر

ایک نظر ڈال کر بتائیے کہ کیا کہ درست نہیں کہ یہ مہاجرینؓ و انصارؓ جن کے قبولِ اسلام میں تلوار کے دخل کے آپ بھی منکر ہوں گے۔ یہی تو وہ اسلام کا پھل تھے جو پھل لگانے کے لئے بانیٔ اسلامؐ دنیا میں تشریف لائے، یہ وہی تو ہیں جنہیں اسلام کا رسولؐ فخر کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر سکتا تھا کہ اے بنی آدم! یہ ہیں وہ کائنات کا خلاصہ جسے پیدا کرنے کے لئے کائنات کو وجود کی خلعت بخشی گئی، یہی ہیں جنہیں آسمانِ ہدایت کے ستارے کہا گیا اور انہی میں سے کچھ تھے جن کے متعلق بدر کے میدان میں پیغمبرِ اسلامؐ نے رو رو کر خدا کے حضور دعا کی کہ اَللّٰھُمَّ اِنْ اَھْلَکْتَ ھٰذِہِ الْعِصَابَۃَ فَلَنْ تُعْبَدَ فِی الْاَرْضِ اَبَداً۔" اے اللہ! اگر اس جماعت کو تُو نے ہلاک ہونے دیا تو زمین میں پھر کبھی تیری عبادت نہ کی جائے گی۔"

یہ وہی عُبّاد کی سرتاج جماعت تھی جن کے دل ربّ العرش کی تخت گاہ بن گئے اور سینے خدا کے ذکر سے معمور ہو گئے۔ یہ کون لوگ تھے اور یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ کیا یہ وہی عرب کے بسنے والے آزاد منش نہ تھے جن کے دل اِلّا ماشاء اللہ قبولِ اسلام سے پہلے طرح طرح کی بدیوں کے پھندوں میں گرفتار تھے اور شرک کا زنگ اُن پر تہہ بتہہ چڑھا ہوا تھا جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے روحانی پانی سے دھویا اور پاک وصاف کیا۔ پھر اُن

کے ظاہر و باطن کو خدا تعالیٰ کے رنگ میں خوب رنگین کر دیا۔ یہاں تک کہ یہ رنگ اُن کی رُوح کی پہنائیوں تک اُتر گیا اور ایسا وافر ہوا کہ پیشانیوں سے پھوٹنے لگا ـــــ مگر ایک مرتبہ بھی اس عظیم روحانی انقلاب کے دوران میں داعیٔ اسلامؑ کو آلاتِ جنگ کی ضرورت پیش نہ آئی۔ کیا وہ بعد کے آنے والے مسلمان جو اسلام کے ایک عام رُوحانی غلبہ کے بعد مسلمان ہو گئے اِن ستاروں کی خاکِ پا کے برابر بھی تھے؟ ...... مولانا! آپ کہاں چلے گئے اور کن ویرانوں میں بھٹک گئے؟ سُنیئے کہ میں خدا کی عظمت اور جلال کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ محمدؐ (صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا دین اپنی اشاعت کے لئے کسی دوسرے سہارے کا محتاج نہ تھا۔ آج بھی نہیں ہے، آئندہ بھی کبھی نہ ہوگا۔

یہ آپ نے کیا کہا کہ تلوار کا کام "قلبہ رانی" ہے اور یہ آپ نے کیا کہہ دیا کہ تلوار قبولِ ہدایت سے پہلے دلوں کے زنگ کو دُور کرتی ہے۔ کیا آپ فطرتِ انسانی کی الف ب پ سے بھی واقف نہیں؟ کیا آپ اِس کھُلی ہوئی حقیقت سے بھی آشنا نہیں کہ تلوار سچّائی کے بیج کے لئے قلبہ رانی نہیں کرتی بلکہ خود نفرت اور بغاوت کے بیج بوتی ہے اور فطرتِ انسانی کے انگ انگ کو زہر آلود کر دیتی ہے۔ نہیں، نہیں اسلام ہرگز تلوار کے جلو میں دلوں پر قبضہ نہیں کرتا بلکہ خود اپنی ذات میں ایک کامل روحانی طاقت ہے جو اپنے حق

کے زور سے ہر سرکش سے سرکش سر کو خم کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ بتائیے کہ عمرؓ کا سر کس نے خم کیا تھا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تلوار نے یا سورۂ مریم کی چند آیات کی تلاوت نے؟

مولانا کو اپنے اس متشدد نظریہ کی تائید میں کہ اسلام تنہا نہیں بلکہ تلوار کے سہارے سے ہی پھیل سکتا ہے تاریخِ اسلام سے اگر کوئی دور کی گواہی مل سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جب اسلام کو فتحِ مکّہ کے بعد سیاسی غلبہ نصیب ہو گیا اور جنگِ حُنَین نے حملہ آور دشمنوں کی رہی سہی طاقت بھی ختم کر دی تو اسلام بڑی تیزی سے پھیلنے لگا۔ یہ ہے وہ تنہا تاریخی دلیل جس کے کھونٹے پر یہ سارا نظریہ ناچ رہا ہے۔ آئیے ہم کچھ دیر کے لئے اس دلیل کو تسلیم کر کے دیکھیں کہ ان بعد کے آنے والے مسلمانوں کے دلوں کو تلوار نے کس درجہ زنگ سے پاک کیا تھا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ وہی بعد کے آنے والے تھے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وصال کے بعد سب سے پہلی خدمتِ اسلام یہ کی کہ اسلامی حکومت کے خلاف ایک عام عَلَمِ بغاوت بلند کر دیا اور لشکر در لشکر مرکزِ اسلام کی طرف چڑھ دوڑے۔

مولانا! آئیے اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے کہ اگر یہی وہ لوگ تھے جن کے سر تلوار نے خم کئے تھے اور جن کے دلوں کو زنگ سے خوب صاف کر کے اسلام کا نور قبول کرنے کے لئے تیار کیا تھا تو یہ زنگ تو دوڑا چلا آتا

ہے اور دلوں کو پھر ہر سمت سے اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ اور دیکھئے کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اس مشکل وقت میں اسلام کے لئے دشمن کے تیروں کے سامنے اپنے سینے سپر کئے۔ کیا وہی ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ نہیں تھے جن کے دلوں سے جاہلیت کے زنگ کو کسی تلوار نے نہیں چھڑایا تھا؟

میں نے مندرجہ بالا استدلال محض اس مفروضہ کو کچھ دیر تسلیم کرتے ہوئے پیش کیا ہے کہ یہی وہ لوگ تھے جن کے دلوں میں اسلام محض اپنی صداقتوں کے زور سے نہیں بلکہ تلوار کی مدد سے داخل ہوا تھا۔ تلوار نے پہلے ہل چلایا پھر اسلام نے بیج بو دیا۔[1] تب کہیں جا کر اسلام کی فصل پیدا ہوئی۔ پس میں مولانا کو اس فصل کا پھل دکھا رہا تھا جو مبینہ طور پر تلوار کے ہل کی پیداوار تھی۔ اب میں قارئین کے سامنے وہ حقائق پیش کرتا ہوں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ عرب کے قبولِ اسلام میں نہ پہلے، نہ درمیان میں، نہ بعد میں کبھی بھی تلوار کو دخل نہیں ہوا۔ سب سے پہلے میں اسی گروہ کے ذکر کو لیتا ہوں جو سب سے بعد میں مسلمان ہوئے اور جن کے متعلق یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے

---

[1] مولانا مودودی اس طریقِ اشاعتِ اسلام کو اپنی کتاب "الجہاد فی الاسلام" کے صفحہ ۱۳۸-۱۳۹ پر پیش فرماتے ہیں۔

براہِ راست تلوار کے خوف سے یا بالواسطہ اس کے اثر سے اسلام قبول کیا۔ لیکن تاریخی حقائق پیش کرنے سے پہلے اِس ضمن میں چند ایک تعارفی کلمات گوش گزار کرنے ضروری سمجھتا ہوں۔

تاریخِ اسلام کے غیر متعصب آزاد مطالعہ کے بعد انسان اِس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسلام کے پھیلانے میں تلوار کبھی بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مددگار نہیں ہوئی بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا مسلمانوں کی دفاعی جنگیں جو سخت مجبوری کے طور پر انسانی جان کی حفاظت کی غرض سے لڑی جارہی تھیں اسلام کے بسرعت پھیلنے کے رستہ میں درحقیقت روک بن رہی تھیں اور یہ رکاوٹ کئی طرق پر پیدا ہوتی تھی مثلاً :۔

(۱) اِن لڑائیوں کو اسلام کے خلاف نفرت پھیلانے کا ایک ذریعہ بنا لیا گیا تھا اور شریر النفس لوگ فرضی مظالم مسلمانوں کی طرف منسوب کر کے سخت اشتعال انگیز نظموں کے ذریعہ عرب میں آتشِ غیظ و غضب بھڑکا رہے تھے۔ چنانچہ کعب بن اشرف کے متعلق روایت آتی ہے کہ یہ بدبخت جنگِ بدر کے بعد خاص طور پر اِس غرض کے لئے مکہ پہنچا تھا کہ اپنی نظموں کے ذریعہ قریش کی آتشِ انتقام کو بھڑکائے۔ اِسی طرح یہی کعب بن اشرف دوسرے قبائلِ عرب میں بھی مسلمانوں کے خلاف زہریلا مواد پھیلاتا رہا۔ اِسکے علاوہ قریش کی طرف سے بھی مسلسل مسلمانوں کو بدنام کرنے کی مذموم کوشش کی جاتی رہی

اور انہیں نعوذ باللہ ایک خونی لٹیروں کے گروہ کے طور پر پیش کیا جاتا رہا۔

(۲) حملہ آوروں میں سے جو مقابل بھی مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جاتے تھے اُن کے پسماندگان عرب دستور کے مطابق انتقام کی قسمیں کھاتے تھے اور سارا کنبہ یا قبیلہ ان موتوں کا اسلام ہی کو ذمہ دار ٹھہراتا تھا اور ناحق یہ دین مظلوم اُن کی نفرت کا نشانہ بن جاتا تھا۔

(۳) ان مخالفانہ حالات میں عرب کی اکثر آبادی تک اسلام کا پیغام پہنچانا اور دلوں سے غلط فہمیوں کو دُور کرنا ایک امرِ محال بن گیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں لازماً تبلیغ ایک بہت ہی محدود دائرے تک مقیّد ہو کر رہ گئی تھی۔

(۴) جن لوگوں تک اسلام کا پیغام پہنچ سکا تھا اور وہ اس کی سچّائی کے قائل بھی ہو چکے تھے اُن میں سے بھی ایک کمزور دل طبقہ محض اس مخالفانہ ماحول سے ڈر کر اس کے اظہار سے رُکا ہوا تھا اور ان لڑائیوں کی ایک دہشت دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔

(۵) انفرادی طور پر دشمنی کا ڈر نہ ہونے کی صورت میں بھی اسلام میں شمولیت ایک خاص جرأت اور مردانگی کو چاہتی تھی کیونکہ اس شمولیت کا مطلب مسلمانوں کی دفاعی جنگوں میں اُن کے ساتھ شریک ہونے کے مترادف تھا اور مسلمانوں کی کمزوری کے پیشِ نظر دوسرے الفاظ میں اس کا یہ

مطلب تھا کہ کوئی جان بوجھ کر آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی موت کے منہ میں قدم رکھ دے۔

(۶) خود حفاظتی کے اقدامات کے سلسلہ میں مسلمانوں کا اتنا وقت صرف ہو جاتا تھا کہ اُنہیں تبلیغی مشاغل کے لئے بہت کم فرصت ملتی تھی۔

اگر میرا مندرجہ بالا دعویٰ درست ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے کہ جونہی جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے اسلام کی اشاعت کی رفتار تیز تر ہو جائے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بعینہٖ ایسا ہی ہوا اور اسلام کے آخری غلبہ سے پہلے بھی صلح کے دَور میں اشاعتِ اسلام کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی۔ اگر کوئی شخص شبہ پر تُل ہی بیٹھے تو فتح مکہ کا دن وہ پہلا دن ہے جس کے بعد یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ تلوار کے ذریعہ حاصل شدہ غلبہ کے نتیجے میں اسلام کو قبول کرنے کی طرف لوگوں کا میلان ہوا۔ مگر صلح حُدیبیہ کے دَور پر تو یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ صلح خود ظاہر نظر میں ایک کمزوری کی دلیل تھی اور دشمن اسے اپنی فتح کا نام دیتا تھا۔ اب دیکھئے کہ دعویٰ نبوت سے لیکر صلح حدیبیہ تک جو مصیبتوں اور بدامنی کا دَور تھا تقریباً اُنیس سال کے عرصہ میں جسقدر لوگوں نے اسلام قبول کیا اُس سے کہیں زیادہ تعداد میں صلح کے دو سالہ دَور میں لوگ مسلمان ہوئے۔ یہ موازنہ حیرت انگیز ہے مگر تاریخ سے ثابت ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ زیادہ سے زیادہ مسلمان مَردوں کی تعداد جو صلح حدیبیہ سے

پہلے کسی جنگ میں شریک ہوئی ہے وہ تقریباً تین ہزار افراد تھی ہے۔ یہ بڑے سے بڑے تخمینہ کے مطابق اسلامی فوج کے اُن سپاہیوں کی تعداد ہے جنہوں نے جنگِ احزاب میں حصہ لیا۔ اِس کے مقابل یہ فتح مکّہ کے موقع پر مسلمان لشکر کی تعداد دس ہزار قدّوسیوں پر مشتمل تھی۔ اِن مزید سات ہزار میں سے بہت ہی کم تھے جو جنگِ احزاب اور صلح حُدیبیہ کے درمیان مسلمان ہوئے اور یقیناً بھاری اکثریّت نے صلح حُدیبیہ کے دو سالہ امن کے دَور میں ہی اسلام قبول کیا۔ چنانچہ حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت خالد بن ولید سیف اللہ بھی اِسی دَور کے مسلمانوں میں سے ہیں۔

یہ موازنہ صاف طور پر ثابت کرتا ہے کہ خود دفاعی جنگیں ہی اشاعتِ اسلام کے لئے مفید نہیں بلکہ مُضر ثابت ہو رہی تھیں۔ کجا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نعوذ باللہ اِس غرض سے مودودی اصطلاح میں "مصلحانہ جنگوں" کا آغاز کرتے۔ اِس کے علاوہ اِس موازنہ سے یہ امر بھی صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ جب فتح مکّہ اور پھر جنگِ حُنین کے بعد امن کا دَور آیا تو اہلِ عرب کا جوق در جوق مسلمان ہونا کسی غلبہ کے اثر سے نہ تھا بلکہ صلح حُدیبیہ کے دَور کی طرح مسلمانوں کی پُرامن تبلیغ کے نتیجہ میں تھا۔

اب رہا یہ سوال کہ اِن بعد کے مسلمانوں نے حضرت ابو بکرؓ کی حکومت کے خلاف کیوں بغاوت کی؟ تو اِس کا جواب بالکل واضح ہے۔ دراصل

اِس دَور کے اکثر مسلمانوں کو جو بدوی قبائل سے تعلق رکھتے تھے براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے تربیت پانے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ بلکہ اکثر بدقسمت اُن میں سے ایسے تھے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے نُورانی چہرہ کو ایک نظر دیکھا بھی نہ تھا۔

اُس زمانہ میں سفر ایسے پُر مشقّت ہؤا کرتے تھے کہ یہ ممکن نہیں تھا کہ دُور دُور کے قبائل کے تمام افراد فرداً فرداً آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اس لئے عرب کے طریق کے مطابق مختلف قبائل یا تو کوئی تبلیغی وفد اپنے ہاں منگوا لیتے تھے یا اپنے وفود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھجوا دیا کرتے تھے۔ جو کافی بحث مباحثہ کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچتے تھے اور پھر وفد کا جو بھی فیصلہ ہوتا تھا قوم اُس کے پیچھے چلتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے تربیت تو درکنار صحابہ کبار رضؓ سے بھی تربیت حاصل نہ کر سکے تھے۔ اِس پر مزید ابتلاء یہ آن پڑا کہ وہ سب ہادیوں کا راہنما اور ہدایتوں کا سورج ان بدقسمتوں کے قبولِ اسلام کے تھوڑی ہی دیر بعد غروب ہو گیا اور ایک نسبتی اعتبار سے اُفقِ عرب پر اندھیرا چھا گیا۔ تاریخ کے ان اوراق میں ہمارے لئے ایک گہرا سبق ہے کہ جب قومیں اپنے وقت کے نبی کا انکار کرتی ہیں اور بزور اُس نور کو بجھانے کی کوشش کرتی ہیں تو اِس دنیا میں ایک

سخت دردناک سزا اُن کو یہ ملتی ہے کہ اُن کی اکثریت کو اُس وقت ایمان نصیب ہوتا ہے جب وہ نبی اُن سے جُدا ہونے کو ہوتا ہے یا پھر اس سے بھی دیر میں اُس نبی کی جُدائی کے بہت بعد۔ پس کیا ہی بدنصیب ہیں وہ عُشّاق جو وصل کے دَور میں تو ایک قابلِ صد محبّت وجود سے نفرت کر رہے ہوں مگر جب فراق کی گھڑی آ پہنچے یا ہجر کی راتیں مسلّط ہو جائیں تو اُن کے قلوب میں شعلۂ عشق بھڑک اُٹھے۔

آئیے اب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعویٰ نبوّت سے لے کر آپ کے وصال تک کی تاریخِ اسلام پر ایک متجسّسانہ نظر ڈال کر دیکھیں کہ کسی دَور میں شاید کسی اور طریق سے جبری طور پر مسلمان بنانے کا کوئی ثبوت ملتا ہو۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ فتوحات کے معاً بعد خوفزدہ مخالفین کو بشدّت اسلام قبول کرنے کی تلقین کی گئی ہو یا اُن کی جان بخشی یا آزادی کے لئے مسلمان ہونا بطور شرط کے رکھ دیا گیا ہو۔

حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو فتحِ مکّہ تک تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔ اوّل وہ انتہائی مظلومی کا دَور جو دعویٰ نبوّت سے لے کر ہجرت تک ممتد ہے اور جسے عرفِ عام میں مکّی دَور کہا جاتا ہے۔ دوسرے وہ مدنی دَور جو سنہِ ہجرت سے لے کر صلح حدیبیہ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ دَور بھی دراصل ایک سخت مظلومی ہی کا دَور ہے۔ کیونکہ اگرچہ مسلمانوں کو دفاع کی

اجازت دیدی گئی تھی مگر وہ اپنے دشمن کے مقابل پر کیا بلحاظ تعداد اور کیا بلحاظ جنگی ساز و سامان کوئی بھی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ سارے عرب کے سینہ میں صرف مدینہ ہی ایک ایسی بستی تھی جہاں ایک مسلمان جمعیت آباد تھی اور اس ایک بستی پر بھی اُن کا مکمل قبضہ نہ تھا بلکہ یہود کے تین متمول قبائل اُس کے ایک بڑے حصہ پر قابض تھے اور اوس و خزرج کے تمام افراد بھی حلقہ بگوشِ اسلام نہ ہوئے تھے۔ اُن کی مثال ایسی ہی تھی جیسے ایک مضبوط پہلوان کے مقابل پر ایک کمزور بچہ کو اپنے دفاع کی اجازت دے دی جائے۔ وہ پہلوان تو زرہ بکتر میں ملبوس ہو، اُس کے ہاتھ میں نیزہ ہو اور تلوار زیبِ کمر ہو اور ایک قد آور جنگی گھوڑے پر سوار ہو مگر وہ بچہ ننگے پاؤں، نیم عریاں، ایک ٹوٹی ہوئی تلوار لیکر اُس کے مقابل پر نکلے۔ سارے عرب کی قوت تو مدینہ میں بسنے والے اِن چند مسلمانوں کے مقابل پر بہت ہی زیادہ تھی۔ صرف جنگ بدر ہی میں حملہ آور دشمنوں اور مسلمانوں کی دفاعی فوج کا موازنہ کیا جائے تو وہ کچھ ایسی قسم کا موازنہ نہ ہوگا۔ پس اِس دَور کو بھی مَیں سخت مظلومی کا دَور ہی کہوں گا۔ ہرچند مانا کہ دفاع کی اجازت مل چکی تھی۔

تیسرا دَور وہ دَور ہے جو صلح حدیبیہ سے شروع ہو کر فتح مکّہ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ صلح اور امن کا دَور تھا جس میں کفارِ مکّہ کی طرف سے مسلمانوں پر کوئی حملہ نہیں کیا گیا۔ تاہم یہود اور بعض دیگر قبائل کی عہد شکنیوں کے

نتیجہ میں بعض غزوات وسرایا وقوع پذیر ہوئے۔

مکّی دَور دَورِ اوّل کے متعلق جو تیرہ سال کی انتہائی مظلومی کا عرصہ ہے اسلام کے اشدّ ترین معاندین بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ اِس دَور میں اسلام کی طرف سے کسی بھی غرض کے لئے تلوار اٹھائی گئی ہو۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ مخالف تلواروں کے خوف کے باوجود کشاں کشاں بہت سے فدائی اسلام میں داخل ہوتے رہے۔ پس مکّہ میں ہونے والے تمام مسلمان جو بعد میں مہاجرین کہلائے اِس الزام سے قطعاً بری ہیں کہ اُن کے قبولِ اسلام میں تلوار کو کوئی دخل تھا۔

ہجرت تا صلح حُدیبیہ دوسرے دَور کے متعلق اِس خیال سے کہ اِس دَور میں مسلمانوں نے اپنے دفاع کے لئے تلوار اٹھائی۔ شاید بعض بدظن طبیعتیں یہ کہہ سکیں کہ ہوسکتا ہے اِس دفاعی تلوار کے خوف سے اسلام پھیلا ہو۔ مگر اس دَور کے اسلام قبول کرنے والوں پر اگر ایک اُچٹتی ہوئی سرسری نگاہ بھی ڈالی جائے تو یہ واہمہ اِس طرح معدوم ہوجاتا ہے جیسے طلوعِ آفتاب پر رات کی تاریکی۔

اِس دَور کے وہ مسلمان جو مدینہ کے باشندے تھے انصار کہلاتے تھے اور یہ تقریباً سارے کے سارے اوس اور خزرج کے قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ اِس کے علاوہ چند افراد نے یہود میں سے اسلام قبول کیا تھا اور

کچھ وہ مسلمان تھے جو مدینہ کے علاوہ دوسری بستیوں کے رہنے والے تھے۔ مکہ میں بھی اسلام کی ترویج کلیتہً بند نہ ہو سکی تھی اور کفارِ مکہ کی شدید ایذا رسانی کے باوجود وہاں اِکّا دُکّا قبولِ اسلام کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔

اس مدنی دَور کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت انصار پر مشتمل تھی اور انصار کا بلا جبر و اکراہ اسلام قبول کرنا بھی ایک ایسی واضح اور نکھری ہوئی حقیقت ہے کہ دوست تو دوست دشمن بھی یہ کہہ نہیں سکتے کہ انصار کو مُہاجرین کی تلوار نے مسلمان بنایا تھا یا اُن کے قبولِ اسلام میں تلوار کو ذرہ بھر بھی کوئی دخل تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے اوس و خزرج کے ساتھ سرے سے کوئی جنگ ہی نہیں لڑی۔ پس بزورِ شمشیر مسلمان بنانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہود میں سے مسلمان ہونے والوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور ان میں سے بھی کسی پر اس شک کی گنجائش موجود نہیں کہ وہ تلوار کے خوف سے مسلمان ہوا بلکہ ان کا مسلمان ہونا ایسے شدید مخالف اور خطرناک حالات میں ہوا جبکہ خود مسلمانوں کا مستقبل بھی بظاہر سخت مخدوش تھا۔ بیرونی قبائل کے نومسلمین بھی جن کی تعداد انصار کی نسبت بہت ہی تھوڑی تھی قطعاً کسی تلوار کے خوف سے مسلمان نہیں ہوئے۔

اب رہیں اس دَور کی جنگیں اور مہمات تو اُن کے نتیجہ میں تلوار کے ڈر سے مسلمان ہونے والوں کی زیادہ سے زیادہ امکانی تعداد جنگی قیدیوں کی تعداد

ہی ہو سکتی ہے ۔ اِس امر کی چھان بین کے لئے ضروری ہے کہ ہم ہجرت سے لے کر صلح حدیبیہ تک کے تمام غزوات و سرایا پر نظر ڈالیں ۔ اِن غزوات و سرایا کی کُل تعداد ۵۰ ہے ۔

غَزوَہ یا سَرِیَّہ سے بعض لوگ غلطی سے جنگ مراد لے لیتے ہیں ۔ لیکن یہ خیال لاعلمی کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے ۔ غزوہ سے مراد محض ایسی مہم ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس شریک ہوئے ۔ خواہ لڑائی ہو ، چور ڈاکو کا تعاقب ہو یا دیکھ بھال کے لئے کوئی پارٹی باہر جائے وغیرہ وغیرہ ۔ اسی طرح سَرِیَّہ سے مراد بھی مہمات ہی ہیں ۔ فرق صرف یہ ہے کہ سَرِیَّہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شامل نہیں ہوئے ۔ مذکورہ بالا کے علاوہ تبلیغی سفر بھی غزوہ اور سریّہ میں شمار ہوتے ہیں اور کسی صحابی کی انفرادی مہم بھی سریّہ ہی کہلاتی ہے ۔ چنانچہ اس دَور میں کل پچاس غزوات و سرایا ہوئے جن میں سے جنگ کہلانے کے مستحق صرف تین ہیں :- جنگِ اُحد ، جنگِ بدر اور جنگِ احزاب ۔ اِن پچاس میں سے ۴۲ میں کوئی اسیر نہیں ہوُا ۔ جن آٹھ میں اسیر ہوئے اُن میں سے قابلِ ذکر تعداد جنگِ بدر کے اسیروں کی ہے ۔ کل ۷۲ ۔ اسیر تھے جن میں سے دو کو بُرا نے جرموں کی پاداش میں قتل کیا گیا اور باقی سب کو فِدیہ لے کر آزاد کر دیا گیا ۔ ان میں سے بعض کا فدیہ یہ تھا کہ انصار بچّوں کو لکھنا سکھا دیں ۔ جنگِ اُحد میں کوئی

دشمن قید نہ ہوا نہ ہی جنگِ احزاب میں کوئی قید ہوا۔ غزوہ بنی مصطلق میں سو سے اوپر زن و مرد اسیر ہوئے مگر سب کو بلا معاوضہ و بلا شرط آزاد کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ چند ایک سریوں میں ایک ایک دو دو قیدی ہاتھ آئے انہیں بلا معاوضہ و بلا شرط رہا کر دیا گیا۔ یہ سب حقائق وہ ہیں جو خود مولانا کو بھی تسلیم ہیں۔

مگر میں کہتا ہوں کہ اگر بفرضِ محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ سب جنگی قیدی بزورِ شمشیر مسلمان بنا لیے گئے تھے تو بھی ان کی تعداد اتنی قلیل اور ناقابلِ ذکر ہے کہ اس کی مہاجرین رض اور انصار رض کے سوادِ اعظم کے مقابل پر کوئی بھی حیثیت نہیں۔ اور اس کو بنیاد بنا کر وہ نتیجہ بہرحال مترتب نہیں ہوتا جو مولانا مودودی نے مرتّب فرمایا ہے سوائے اس کے کہ تمسخر کے طور پر کسی کو ہنسانے کے لئے یہ بات کہی جائے یا شدید تعصّب کی ایسی پٹّی آنکھوں پر بندھی ہوئی ہو کہ معترض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام تراشی کے لئے تنکوں کے سہارے کو بھی غنیمت جانتا ہو۔

تیسرا دور۔ صُلحِ حُدیبیہ تا فتحِ مکّہ

اس دور میں ہونے والے غزوات و سرایا کی تعداد بائیس ۲۲ ہے۔ ان میں سے صرف تین ۳ ایسے تھے جن میں جنگی قیدی ہاتھ آئے۔ ایک سریّۂ حسمی (جمادی الآخر ۶ھ ہجری) ہے جس میں حضرت

زید بن حارثہؓ نے ھنید ڈاکو اور اُس کے ساتھی لٹیروں پر چڑھائی کی اور سو لٹیروں کو اسیر بنایا مگر توبہ کا وعدہ لے کر چھوڑ دیا ـــــ اس کے علاوہ سریّہ بنو کلاب اور سریّہ بشیر بن سعد انصاری میں چند گنتی کے قیدی ہاتھ آئے مگر اُن کے حالات نامعلوم ہیں۔

پس اِس امر میں کوئی بھی شک باقی نہیں رہ جاتا کہ ہجرت سے لے کر فتح مکہ تک ایک بھی قیدی کو بزورِ شمشیر مسلمان بنانے کا ذکر نہیں ملتا۔ اور نہ ہی ان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ تلوار نے تو صرف زنگ صاف کیا تھا۔ اِس کے بعد اسلام کا رنگ ان کے دلوں پر چڑھایا گیا۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ اُنہیں پھر اُسی زنگ آلود شرک کی دنیا میں واپس لوٹنے کی اجازت دیدی گئی۔ پھر کیا مولانا مودودی بتا سکتے ہیں کہ آخر وہ کون لوگ تھے جن کو اپنی تمام اخلاقی اور روحانی قوتوں کی ناکامی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ تلوار کی چمک دکھلا کر مسلمان بنایا تھا۔ وہ کب پیدا ہوئے کس جگہ کے رہنے والے تھے۔ کہاں سے آئے تھے اور کہاں چلے گئے۔ کیا اُنہیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟ اور اگر اُن کا وجود محض مولانا کے تصوّر کی پیدا وار ہے اور یقیناً اُنہی کے تصور کی پیدا وار ہے تو پھر کیوں سیّدِ وُلدِ آدمؑ پر ایسی سنگین اور بے بنیاد الزام تراشی سے نہیں رُکتے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مذہب میں جبر کے قائل ہوتے تو کیوں نوکِ خنجر پر ان بے بس قیدیوں کو مسلمان

نہ بنا لیا؟

بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ

مؤخّر الذکر دونوں ادوار کے قیدیوں کی تعداد میں یہود قبائل بنو قینقاع۔ بنو نضیر اور بنو قریظہ کے قیدیوں کا شمار شامل نہیں جن کے ساتھ مختلف وقتوں میں مسلمانوں کو مقابلہ کرنا پڑا۔ ان کا مختصر ذکر اب علیحدہ طور پر کیا جا رہا ہے۔

اس حصّۂ مضمون کا تعلق محض اس الزام سے ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غلبۂ اسلام اخلاقی قوّتوں کی بجائے تلوار کے زور سے ہوا تھا اور ہم اس وقت صرف اس امر کی چھان بین کر رہے ہیں کہ اس تمام جنگی دَور میں کل کتنے ایسے قیدی ہاتھ آئے تھے جن کو بزور مسلمان بنا لیا گیا تھا یا جن کے قبولِ اسلام پر یہ شُبہ بھی پڑ سکتا ہے۔

اب تک جو ہم نے جستجو کی ہے اس سے تو معاملہ بالکل برعکس نظر آ رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم قیدیوں کے گروہ کے گروہ دیکھیں جو مسلمانوں کی تلواروں کے نیچے کانپتے ہوئے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ پڑھ رہے ہوں ہم دیکھتے یہ ہیں کہ تلواروں کی وجہ سے نہیں بلکہ دشمن تلواروں کے خوف کے باوجود اہلِ عرب مسلسل مسلمان ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ہم دیکھتے یہ ہیں کہ باوجود اس کے کہ مظلوم مسلمان عملاً مدینہ کی ایک چھوٹی سی بستی میں قید ہیں جو

اندر سے بھی محفوظ نہیں کیونکہ اندر بیٹھے ہوئے یہود جب موقع پاتے ہیں شرارت کرتے ہیں اور باہر سے بھی محفوظ نہیں۔ کیونکہ سارا عرب اُن کی جان کا دشمن ہو رہا ہے۔ مگر پھر بھی کچھ سرفروش ایسے ہیں جو مسلمان ہو ہو کر اس جماعت میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر مخالفت کو ایک آگ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے تو مدینہ میں مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ ایک بھڑکتی ہوئی آگ میں ایک نقطہ کی طرح تھے جسے جلانے کے لئے وہ آگ چاروں طرف سرزمینِ عرب میں بھڑک رہی تھی۔ یہ میں اس دَور کا ذکر کر رہا ہوں جسے دشمنانِ اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طاقت اور شمشیر کا دَور کہتے ہیں۔ پس اس دَور میں جو لوگ مسلمان ہو کر مدینہ آ بیٹھتے تھے وہ تو جلانے والوں کو چھوڑ کر جلنے والوں میں شامل ہونے آیا کرتے تھے۔ اکثریت کو چھوڑ کر اقلیت کی طرف بھاگتے تھے اور جو لوگ مدینہ کی طرف ہجرت نہیں کر سکتے تھے اور مخالف ماحول ہی میں رہنے پر مجبور تھے اُن کی مثال بھی کچھ اِس قسم کی تھی جیسے وحشی بھیڑیوں کے کے ایک غول میں کوئی بھیڑیا برضا و رغبت اچانک بھیڑ بن جائے۔ اُس بے چارے کے متعلق یہ کہنا کہ ایک چھوٹے سے بھیڑوں کے گلّہ نے جو ایک بھیڑیوں سے بھرے ہوئے جنگل میں گھرا ہوا تھا اُسے ڈرا دھمکا کر اور مجبور کر کے بھیڑ بنایا ہے اِس سے زیادہ تمسخر آمیز دعویٰ اور کیا ہو سکتا ہے؟

یہود قبائل اور اُن کے "قیدیوں" کا ذکر میں اس لئے الگ کر رہا ہوں

تاکہ اُس اندرونی خطرہ کی طرف بھی قارئین کی توجہ مبذول کراؤں جو ہر وقت مدینہ کے اندر سے اُنہیں لاحق تھا۔ یہ تینوں قبائل ایسے بدعہد، کمینہ فطرت اور دغاباز تھے کہ امن میں بھی مسلمانوں کو چین نہیں لینے دیتے تھے اور جنگ کے زمانہ میں تو اُن کی شرارتیں غیر مشکوک غداری میں بدل جاتی تھیں۔ چنانچہ مسلمانوں سے دوستی کے معاہدہ کے باوجود اُس وقت جبکہ مٹھی بھر مسلمان جنگِ بدر میں حملہ آوروں سے برسرِ پیکار تھے قبیلہ بنو قینقاع نے مدینہ میں بلوہ کیا اور فساد برپا کیا اور سراسر جھوٹی اور سراسیمہ کرنے والی خبریں پھیلائیں آج بھی اِس جرم کی سزا ہر رحمدل سے رحمدل حکومت کے نزدیک قتل کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی خصوصاً اُس معاہدہ کے پیشِ نظر جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مدنی دَور کے پہلے سال ہی میں یہود سمیت مدینہ کی تمام اقوام سے کیا تھا۔ یہ تمام غدّار قتل کئے جانے کے سزاوار تھے۔ "سیرت ابن ہشام" جلد اوّل (مطبوعہ مطبع بولاق مصریّہ) کے صفحہ ۷۰ پر یہ معاہدہ درج ہے۔

اس معاہدہ کی شرائط میں سے تین یہ تھیں:۔

- "جنگ کے دنوں میں یہودی مسلمانوں کے ساتھ مصارف میں شریک رہیں گے۔
- کوئی شخص اپنے معاہد کے مقابل پر مخالفانہ کارروائی

نہیں کرے گا۔

• مدینہ کے اندر کُشت و خون کرنا اس معاہدہ کرنے والی سب قوموں پر حرام ہو گا۔"

مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ازراہِ شفقت محض جلاوطنی کی سزا پر اکتفاء فرمائی۔ میرا ایمان ہے کہ اگر آئندہ مخدوش حالات کے پیشِ نظر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ بعد کے حملہ آوروں کے ساتھ مِل کر یہ بدعہد یہود مسلمانوں کو اِس سے بھی زیادہ نقصان پہنچائیں گے تو آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اُن کو یہ سزا بھی نہ دیتے اور بالکل معاف فرما دیتے۔ بہرحال اصل سوال زیرِ بحث یہ ہے کہ اس قبیلہ کو باوجود غلبہ کے بزورِ شمشیر مسلمان نہیں بنایا گیا۔

دوسرا یہود قبیلہ جسے ارتکابِ بغاوت پر اور اِس جُرم کی پاداش میں کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو زہر دیکر ہلاک کرنے کی کوشش کی جلاوطن کیا گیا قبیلہ بنو نضیر تھا۔ چونکہ مسلمانوں کے خلاف شرارتوں میں اور عہد شکنی میں سارا قبیلہ شامل تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہلاک کرنے کی کوشش ایک منظم سازش کا نتیجہ تھی اس لئے دراصل یہ کینہ توز بھی معاہدہ اور عام انسانی قانون کی رُو سے اپنی زندگی کے حق سے محروم ہو چکے تھے لیکن اُن کے ساتھ بھی اِس لحاظ سے غیر معمولی نرمی کا سلوک کیا گیا

اور صرف شہر بدر کرنے پر اکتفاء کی گئی اور بہر حال یہ امر یقینی طور پر ثابت ہے کہ تلوار کے زور سے انہیں مسلمان نہ بنایا گیا۔

تیسرا بدقسمت یہودی قبیلہ بنو قریظہ ہے۔ اِس قبیلہ کی غداری باقی تمام قبیلوں سے زیادہ سنگین تھی کیونکہ اُس وقت جبکہ جنگِ احزاب کے موقع پر دل ہلا دینے والے خطرات نے مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور مدینہ میں محصور قلیل التعداد مسلمانوں اور کفّار کے عظیم حملہ آور لشکر کے درمیان صرف ایک تنگ خندق حائل تھی انہوں نے انتہائی کمینگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خطرناک بدعہدی کی اور دشمن کے ساتھ خفیہ سازشیں کرنے لگے۔

اگر کوئی شخص آج اِس خطرہ کا کچھ تصوّر باندھنا چاہے تو اُس کا صرف ایک ہی طریق ہے کہ قرآن کریم کی اُن آیات کا مطالعہ کرے جن میں خود خدا تعالیٰ اپنے الفاظ میں اس کا نقشہ کھینچتا ہے :-

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۠ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝ (سورۃ الاحزاب ع ۲)

"جب وہ (دشمن) تمہارے اُوپر سے بھی (حملہ کرتے ہوئے) آئے اور نیچے سے بھی (یعنی بلندی کی طرف سے بھی اور ڈھلوان کی طرف سے بھی یا معنوی لحاظ سے جب تمہاری نجات کے سارے دروازے بند ہو گئے۔ زمین بھی تنگ ہو گئی اور آسمان بھی) اور جب آنکھیں پھر گئیں اور دل (مارے دہشت کے) گلوں تک پہنچ گئے اور تم خدا کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ یہ تھا وہ مقام اور وہ وقت جبکہ مومن آزمائے گئے اور شدید زلازل کے جھٹکوں میں انہیں مبتلاء کیا گیا۔

یعنی جس طرح خوفناک زلزلوں کے جھٹکوں کے وقت عمارتوں کی مضبوطی آزمائی جاتی ہے اور سوائے اُن عمارتوں کے جن کی دیواروں کو پگھلا ہؤا سیسہ پلایا گیا ہو یا فولادی بندھنوں سے مضبوط کیا گیا ہو اور وہ گہری بنیادوں پر مضبوط چٹانوں کی طرح قائم ہوں باقی تمام عمارتیں ان جھٹکوں کا شکار ہو کر پیوندِ خاک ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح مومنین کی اس عمارت کے لئے ایک دل ہلا دینے والی آزمائش کا دن تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ خدا تعالیٰ اہلِ مدینہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

"تم (اِس شدید خطرہ کو دیکھ کر) اللہ تعالیٰ پر طرح طرح کے گمان کرنے لگ گئے تھے۔"

پس ایک طرف تو قرآنی بیان کے مطابق بیرونی خطرہ ایسا شدید تھا دوسری طرف اندرونی خطرہ کی یہ حالت تھی کہ منافق کُھلم کُھلا مومنوں کے حوصلے پست کرنے میں مصروف تھے۔ اسی اندرونی خطرہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اگلی آیت میں فرماتا ہے:۔

وَإِذْ يَقُولُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ إِلَّا غُرُوْرًا ○ وَإِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓأَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ...... (سورہ الاحزاب)

"اور جب منافق اور دلوں کے مریض یہ کہہ رہے تھے کہ خدا اور اس کے رسول نے ہم سے دھوکہ کے سوا اور کوئی وعدہ نہیں کیا اور جب اُن میں سے ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ یثرب کے رہنے والو! (بھاگنے کا تو کیا سوال) تمہارے لئے ٹھہرنے تک کی کوئی جگہ نہیں اس لئے (اپنے پہلے دین میں) پھر جاؤ۔"

پس اُس ہولناک ابتلاؤں کے وقت جبکہ مسلمانوں کو خطرات نے اُوپر سے بھی آن لیا تھا اور نیچے سے بھی۔ اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔ بنو قریظہ جن کو معاہدہ کی رُو سے مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہیئے تھا اُن کی کمینگی اور غدّاری کا یہ حال تھا کہ حملہ آوروں کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف عہد و پیمان کرنے لگے۔

چنانچہ اس غدّاری کے نتیجہ میں جنگِ احزاب کے بعد جب مسلمانوں نے اُن پر غلبہ پالیا اور سزا کی تعیین کا وقت آیا تو ان بدبختوں نے اپنی قسمت کا فیصلہ رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِیْنَ ؐ کے ہاتھ میں چھوڑنے کی بجائے حضرت سعد بن معاذؓ کے ہاتھ میں دیدیا جن کے حکم سے سارے مرد تہِ تیغ کئے گئے۔ یہاں سوال زیرِ بحث یہ ہے کہ ان کو بھی بزورِ شمشیر مسلمان نہیں بنایا گیا۔ پھر کیا میں مولانا سے یہ پوچھنے میں حق بجانب نہیں ہوں کہ آخروہ کون لوگ تھے جو اسلام کی تلوار کے اثر سے مسلمان ہوئے ؟

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ تاریخ کے سبق کے دوران میں یونیورسٹی آف لنڈن کے تاریخ کے ایک متعصب پروفیسر نے اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ظلم کا الزام لگایا۔ میں اور میرے ایک عزیز دوست میر محمود احمد صاحب ناصر اسے برداشت نہ کرسکے اور جواب دینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اِس پر اُس پروفیسر نے کہا کہ یہاں بحث کا وقت نہیں تم نے جو کچھ کہنا ہو میرے کمرہ میں آکر کہنا۔ مگر ہم نے اُسے یہ جواب دیا کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ ہمارے آقا پر حملہ تو تم برسرِعام کرو اور جواب ہم علیحدگی میں دیں۔ چنانچہ جب ہم نے اس بارہ میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی تو ایک یہودی طالب علم اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے یہ اعلان کیا کہ ” اگرچہ میں یہودی ہوں اور سب سے زیادہ مجھے اِس بات کا غصہ ہونا چاہیئے تھا مگر یہ بحث سننے کے بعد میں اِس

بات کی گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اس واقعہ سے ہرگز کوئی حرف نہیں آتا۔ کیونکہ اول تو یہ فیصلہ اُن کا نہیں تھا۔ دوسرے سعد بن معاذؓ کا فیصلہ بھی میرے نزدیک درست تھا اور وہ غدار اس لائق تھے کہ اُنہیں تہ تیغ کیا جاتا"۔

آج تک اس شریف النفس یہودی کے الفاظ کا میرے دل پر گہرا اثر ہے اور میں تادمِ مرگ اس کا ممنونِ احسان رہوں گا اور ہمیشہ دل سے اس کے لئے دعا نکلتی رہے گی کہ اس نے انصاف کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور غیر معمولی شرافت اور جرأت کا اظہار کرتے ہوئے میرے محبوب آقاؐ کی بریت کی۔ مگر جب میری نظر اُن لوگوں کی طرف لوٹتی ہے جن کے نزدیک بانیٔ اسلام کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے میں قرآن تھا تو سینہ میں دل خون ہونے لگتا ہے۔

فتح مکہ

صلح حدیبیہ تک کا دور ختم ہوا اور فتح مکہ کا دن آگیا جو دراصل حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات پر سے ہر تشدد کے الزام کو دور کرنے کا دن تھا۔ اس دن آنحضورؐ نے کفارِ مکہ پر ایک عظیم فتح حاصل کی مگر کسی فردِ واحد کو بھی تلوار کے زور سے مسلمان نہ بنایا۔ پس میں اُسی دن کا واسطہ دیکر یہ الزام لگانے والوں سے پوچھتا ہوں کہ جب وہ نبیوں کا سردار دس ہزار قدسیوں کے ساتھ فاران کی چوٹیوں سے جلوہ گر ہوا اور مکہ کو اس کی شوکت اور جلال نے ڈھانپ لیا تو وہ جبر کی تلوار کیوں

زیرِ نیام چلی گئی۔ کیوں فتح مکہ کے روز جب مشرکینِ مکّہ کی گردنیں اُس رسول ؐ کے ہاتھ میں دی گئیں۔ جب تلواروں کے سائے تلے سرکشوں کے سر خم کرنے کا وقت آیا اور نوکِ خنجر پر ایمان قلوب میں اُتارنے کی مبارک گھڑی آن پہنچی۔ وہ ساعت جب کہ مسلمان فاتحین کے خوف سے عرب سرداروں کے جسم لرزاں تھے اور سینوں میں دل دھڑک رہے تھے۔ جب مکّہ کی بستی ایک دھڑکتا ہوا دل بن گئی تھی تو کیوں اُس فاتحین کے سردار نے شمشیر کی قوّت سے اُن کو مسلمان نہیں بنا لیا؟ اگر ایسا نہیں کیا اور یقیناً نہیں کیا تو پھر حیرت ہے کہ کس دل کے ساتھ یہ لوگ اُس سب محبوبوں کے محبوب اُس بے مثال دلوں کے فتح کرنے والے کے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُس کی ہر قوّتِ جاذبہ کی ناکامی کے بعد تلوار کی قوّت کارگر ثابت ہوئی۔ مولانا کے دل کا حال مَیں نہیں جانتا کہ یہ لکھتے ہوئے اُس پر کیا گزری تھی یا کیا گزر سکتی تھی۔ مگر اے کاش! کہ اُن کا قلم پھٹ جاتا اور سیاہی خون ہو جاتی۔

فتح مکّہ کا دن تو وہ دن ہے کہ جو ابدالآباد تک آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پاک ذات پر سے جبر و تشدّد کے الزام کی نفی کرتا رہے گا۔ اُس دن کی گواہی ایک ایسی پُر شوکت اور بلند بانگ گواہی ہے کہ کتنی ہی صدیاں گزر گئیں مگر آج بھی مؤرخین کے کان اُس کو سُنتے اور اُن کے دل اُس پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ گواہی تو عیسائیوں نے بھی سُنی اور اہلِ ہنود نے

بھی اُسے قبول کیا۔ پھر حیرت ہے کہ مولانا کے کان اس بے مثال دن کی آواز سُننے سے کیوں محروم رہ گئے۔ اِسی دن کی گواہی کا ذکر کرتے ہوئے ایک عیسائی مستشرق مسٹر سٹینلے لین پول لکھتے ہیں :-

"اب وقت تھا کہ پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم۔ ناقل) خونخوارانہ فطرت کا اظہار کرتے۔ آپ کے قدیم ایذاد ہندے آپ کے قدموں میں آ پڑے ہیں۔ کیا آپ اِس وقت اپنے بے رحمانہ طریقہ سے ان کو پامال کریں گے؟ سخت عقوبت میں گرفتار کریں گے یا ان سے انتقام لیں گے؟

یہ وقت اُس شخص کے اپنے اصلی رُوپ میں ظاہر ہونے کا ہے۔ اِس وقت ہم ایسے مظالم کے پیش آنے کے متوقع ہیں جن کے سُننے سے رونگٹے کھڑے ہوں اور جن کا خیال کر کے اگر ہم پہلے ہی سے نفرین و ملامت کا شور مچائیں تو بجا ہے۔

مگر یہ کیا معاملہ ہے؟ —— کیا بازاروں میں کوئی خون ریزی نہیں ہوئی؟ —— ہزاروں مقتولوں کی لاشیں کہاں ہیں؟ — واقعات سخت اور بے درد ہوتے ہیں (کسی کی رعایت نہیں کرتے) اور یہ ایک واقعی بات ہے کہ جس دن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم۔ ناقل) کو اپنے دشمنوں پر فتح حاصل ہوئی

وہی دن آپ کو اپنے نفس پر سب سے زیادہ عالی شان فتح حاصل کرنے کا دن بھی تھا، قریش نے سالہا سال تک جو کچھ رنج اور صدمے دیئے تھے اور بے رحمانہ تحقیر و تذلیل کی مصیبت آپ پر ڈالی تھی آپ نے کشادہ دلی کے ساتھ اُن تمام باتوں سے درگذر کی اور مکّہ کے تمام باشندوں کو ایک عام معافی نامہ دیدیا۔"[1]

یا شاید ہمارے بعض علماء کے دل کی آواز یہ کہے کہ مکّہ کے تمام باشندوں کو ایک عام معافی نامہ دیدیا اور اہلِ مکّہ کو بزور مسلمان بنانے کا ایک عظیم الشان موقعہ خود اپنے ہاتھوں سے کھو دیا ـــــ

مگر واقعات سخت اور بے درد ہوتے ہیں اور کسی کی رعایت نہیں کرتے ہاں مگر واقعات سے آنکھیں موند لی جائیں تو ......؟

اور واقعات سے آنکھیں موندی جا رہی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سراسر دفاعی جنگوں کو جارحیّت اور تشدّد کی جنگیں قرار دیا جا رہا ہے اور حد یہ ہے کہ یہ بے بنیاد الزام واضح تاریخی حقائق کے خلاف جا کر لگایا جاتا ہے۔

فتح مکّہ سے لیکر وصال نبوی تک

ممکن ہے کوئی یہاں پہنچ کر اس وہم میں مبتلا ہو جائے کہ جبری مسلمان کہیں فتح مکّہ کے بعد کی جنگوں میں نہ بنائے گئے ہوں۔ ....

---

[1] "انتخاب قرآن" ـ مقدمہ صـ۶۷

.... مگر فتحِ مکّہ کے بعد کی جنگوں پر

ایک نظر ڈالنے سے ہی اس وہم کی قلعی کھل جاتی ہے جو غالب کے اس شعر کے

مصداق ہے کہ ؎

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے

دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہُوا !

چنانچہ فتح مکّہ کے بعد کے غزوات و سرایا کے اعداد و شمار بھی درج ذیل

کئے جاتے ہیں :-

فتح مکّہ کے بعد ایسے سرایا جن میں نہ کوئی لڑائی ہوئی نہ کوئی اسیر ہُوا نہ مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔	=	۳
ایسے غزوات یا سرایا جن میں جنگی قیدی ہاتھ آئے۔	=	۴

جنگی قیدیوں کی کل تعداد = ۶۰۰۰ + ۶۲ + اسیرانِ بنوطیؒ + ۱

اس دَور میں اسیروں کی تعداد گزشتہ سب ادوار سے غیر معمولی طور پر

زیادہ ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ صرف ایک جنگِ حُنین ہی میں چھ ہزار کی تعداد

میں دشمن اسیر ہوئے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ ان اسیروں سے رَحْمَۃٌ لِّلْعَالَمِیْنَ

نے کیا سلوک کیا۔ کیا سب تہِ تیغ کر دیئے گئے یا نوکِ خنجر پر مسلمان بنا لئے گئے ؟۔

نہیں۔ ایک بھی نہیں۔ بلکہ بلا استثنا سارے کے سارے غیر مشروط طور پر رہا کر دیئے

گئے۔ جنگِ حُنین کے چھ ہزار اسیروں کو رَحْمَۃٌ لِّلْعَالَمِیْنَ نے نہ صرف

غیر مشروط طور پر رہا فرما دیا بلکہ اُن میں سے بعض کو خلعتیں بھی عطا فرمائیں اور انعام و اکرام سے نوازا۔ رحم و کرم کی حد یہ ہے کہ اُن میں سے بعض قیدیوں کا فدیہ بھی اپنی جیب سے ادا فرمایا۔ اسی قسم کے رحم و کرم کا سلوک بنی طیؑ کے اسیران سے کیا اور حاتم کی بیٹی کو تو غیر معمولی اکرام کے ساتھ رخصت فرمایا۔

اِس کے علاوہ اِس دَور میں سریۃ عُیَینہ بن حصین میں قبیلہ بنو تمیم کے باسٹھ[۶۲] اسیر مدینہ لائے گئے مگر اس قبیلہ کے سردار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رحم کی درخواست کی جس پر اُس رحمِ مجسّم نے اُن سب کو رہا فرما دیا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے ہمیشہ جو سلوک جنگی قیدیوں سے روا رکھا وہ نہایت کریمانہ اور فیّاضانہ تھا۔ ظالم تو ظلم کا بہانہ ڈھونڈا کرتا ہے مگر آپ رحم و کرم کا بہانہ ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔ بنو ہوازن کے قیدیوں کو معاف کرنے کا واقعہ بھی عجیب ہے اور اِسی ایک واقعہ ہی سے مفتوحین کے بارہ میں آپؐ کے جذبات اور طرزِ فکر کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔

اِن قیدیوں کے بارہ میں رحم کی درخواست کی غرض سے بنو ہوازن کا ایک وفد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو حضرت حلیمہ دائی کا واسطہ دیکر جو اسی قبیلہ کی تھیں آپؐ سے معافی کا طلبگار ہوا۔ اُس وقت آپؐ نے اُن سے یہ نہیں پوچھا کہ اب ہار کھا جانے کے بعد تمہیں اپنے قبیلہ کی وہ دائی یاد

آگئی جس نے مجھے دودھ پلایا تھا مگر جب تم مکّہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے تھے یا جب حُنین کی وادی میں مجھ پر اور میرے ساتھ چند نرغے میں آئے ہوئے فدائیوں پر تیروں کی بارش برسا رہے تھے تو اُس وقت کیا تمہیں یاد نہ آیا کہ یہ تو وہی معصوم یتیم بچّہ ہے جس نے ہمارے قبیلہ میں پرورش پائی تھی؟ نہیں۔ آپؐ نے ایسا کوئی سوال نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ جس قدر قیدی میرے اور بنو عبدالمطلب کے حصّہ کے ہیں اُن کو لے جاؤ وہ آزاد ہیں۔ یہ چند کلمات آپؐ کے بے مثال خلق اور گہری فراست پر وسیع روشنی ڈالتے ہیں۔ اوّل تو ایک دُور کی رضاعی ماں کی یاد میں اُس کے قبیلہ کے بعد میں آنے والے ظالموں کو جو اپنی طرف سے تو آپؐ کو ہلاک کرنے کی پُوری کوشش کر چکے تھے اِس طرح معاف فرما دینا ایک بے حد پیارا اور کریمانہ فعل ہے۔ دوسرے آپؐ کا یہ فرمانا کہ صرف بنو عبدالمطلب کے حصّہ کے قیدی آزاد ہیں آپؐ کی فراست اور خُلق کے بعض اور پہلوؤں پر بھی عجیب روشنی ڈالتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ سب کو معاف کر کے آزاد کر دوں مگر چونکہ حضرت حلیمہ کی رضاعت کا تعلق محض آپؐ کی ذات یا زیادہ سے زیادہ اس واسطہ سے آپؐ کے خاندان کے ساتھ ہو سکتا تھا اس لئے آپؐ نے یہ پسند نہ فرمایا کہ ایک ذاتی تعلق کی بناء پر باقی مسلمانوں کو بھی اس احسان کا پابند کر دوں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ آپؐ کے رحم وکرم

کی خصلت تمام انسانوں میں اپنی وسعت اور گہرائی کے لحاظ سے بے مثال تھی لیکن غیر متوازن نہ تھی۔ آپؐ ایک ایسے رحمدل انسان کی طرح نہ تھے جو اپنے رحم و کرم کے جوش میں دوسروں کے حقوق بھی لوگوں کو بخش دیتا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے ایسا نہ کیا بلکہ جو طریق اختیار کیا وہ جُود و کرم کے آسمان پر ہمیشہ چاند ستاروں کی طرح چمکتا رہے گا۔ آپؐ جانتے تھے کہ اگر اس بارہ میں لوگوں سے مشورہ کرنے کی بجائے مَیں نے قیدیوں کو آزاد کرنے کی ایک عملی مثال قائم کر دی تو کسی مسلمان گھر میں کوئی قیدی نہ رہے گا۔ پس آپؐ نے ایسا ہی کیا اور جب آپؐ کے اس فرمان کی خبر عُشّاق کے کانوں تک پہنچی کہ "میرے اور بنو عبد المطلب کے حصّہ کے سب قیدی آزاد ہیں" تو انہوں نے بے اختیار عرض کی کہ اے ہمارے محبوب "ماکان لنا فهو لرسول الله" جو کچھ ہمارا ہے وہ تو سب رسول اللہ ہی کا ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے اُن قیدیوں کو آزاد کرنے میں وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے لگے اور فضاء نعرہ ہائے جنگ اور زخمیوں کی آہ و پکار کی بجائے آزادی کے ترانوں سے گونج اُٹھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم بے حد رحیم و کریم تھے۔ بنو طی کے قیدیوں کی آزادی بھی آپؐ کے خُلق کے ایک خاص پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔ ان قیدیوں کو صرف اِس وجہ سے بغیر کسی معاوضہ کے آزاد کر دیا گیا کہ عرب کے ایک

مشہور سخی حاتم طائی کی بیٹی جو خود اِن قیدیوں میں شریک تھی اپنی آزادی کو صرف اِس شرط پر قبول کرنے کے لئے تیار تھی کہ باقی قیدیوں کو بھی ساتھ رہا کیا جائے۔ چنانچہ ایک گزرے ہوئے حاتم کی سخاوت کے نام پہ اُس کی قوم کے شریروں کو رہا کر دیا گیا۔ اور اِس موقعہ پر بنو عبد المطلب کے قیدیوں کی کوئی شرط نہ رکھی کیونکہ یہاں جس بناء پر قیدیوں کو رہا کیا جا رہا تھا وہ سارے عرب میں مشترک تھی۔ حاتم کی سخاوت ایک قومی سرمایہ تھی جس پہ فخر کرنے میں سارا عرب شریک تھا۔

اِن حالات پر جب نظر پڑتی ہے تو بے اختیار دل آپ پہ درود بھیجنے لگتا ہے اور کسی طرح یقین نہیں آتا کہ اس سراپا رحمت و شفقت اور سب کریموں سے بڑھ کر کریم نبیؐ پر بھی کوئی یہ الزام لگا سکتا ہے کہ آپ کی کوئی ایک جنگ بھی اسلام پھیلانے کی غرض سے تھی یا اِس غرض سے تھی کہ تلوار کے پھل سے دلوں کی زمین میں ہل چلا کر اسلام کا بیج بویا جائے۔ نظریات کی اشاعت کے یہ تصوّرات تو کارل مارکس اور لینن اور سٹالن کے نظریات تھے۔ پھر مولانا کیوں نہیں سوچتے کہ اِن اشتراکی سطح سے بہت بالا تھے اُس سیّدِ وُلدِ آدمؑ کے خیالات جس کی اُڑان سدرۃ المنتہیٰ کی بلندیوں تک تھی اور جو تمام مخلوقات میں سب سے اعلیٰ اور ارفع مقام تک جا پہنچا تھا۔

مولانا کی سوچی ہوئی پالیسی کو اُس رُوحانی پالیسی سے کوئی نسبت نہیں

ہے جس کا الہام آپؐ کی پاک اور شفّاف فطرت پر انوارِ سماوی کی صورت میں نازل ہوتا تھا۔ اُس رسول کی پالیسی سے جس کی فراست خدا کی فراست تھی اور جسے لطیف و خبیر کی طرف سے ایک نہایت باریک بین نظر عطا ہوئی تھی۔ خاک کو بھلا عالمِ پاک سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ مولانا نے جو کچھ کہا بہت بُرا کہا اور ناحق کہا۔ انہیں کب یہ حق پہنچتا تھا کہ اپنے گھناؤنے تصوّرات کو اُس انسانِ کامل کی طرف منسوب کرتے۔ حصولِ اقتدار کا کیا یہ صرف ایک ہی بہانہ رہ گیا تھا؟

اقتدار کی تڑپ

مودودی صاحب کی مختلف کتب کے مطالعہ کے بعد میں اِس یقینی نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ موصوف کی نفسیات کے تجزیہ کا ماحصل اِن تین لفظوں میں سمٹا ہوا ہے —— "اقتدار کی تڑپ" ——

یہ اقتدار کی تڑپ ایسی بے حد و بے پناہ ہے کہ اُن کے ہر نظریۂ حیات پر مسلط ہو چکی ہے۔

اُن کے نزدیک عبادتِ الٰہی کا مفہوم بھی اِس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کے بعض بندوں کو صالح بنا کر دوسرے بندگانِ خدا پر حکومت کرنے کا اہل بنایا جائے اور عبادتوں کے رُوحانی پہلو کی طرف ذرا بھی اُن کی نگاہ نہیں اُٹھتی۔

وہ بھول جاتے ہیں کہ عبادت کی بُنیادی غرض بندے کا خدا تعالیٰ سے وصال کرانا ہے یعنی اُس مقصد کا پُورا کرنا ہے جس کی خاطر جن و اِنس کو پیدا کیا گیا۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ عبادت کائنات کی تخلیق کا مقصود ہے کسی ثانوی مقصد

کے حصول کا ذریعہ نہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ عبادت کو جنّ و انس کی خاطر پیدا نہیں کیا گیا بلکہ جنّ و انس کو عبادت کی خاطر پیدا کیا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ہم نے عبادت کی خاطر ہی جنّ و انس کو پیدا کیا ہے مگر مولانا کا اصرار ہے کہ:۔

"یہ نماز اور روزہ۔ یہ زکوٰۃ اور حج دراصل اسی تیاری اور تربیت کے لئے ہیں جس طرح تمام دنیا کی سلطنتیں اپنی اپنی فوج پولیس اور سول سروس کے لئے آدمیوں کو پہلے خاص قسم کی ٹریننگ دیتی ہیں پھر اُن سے کام لیتی ہیں اسی طرح اسلام بھی ان تمام آدمیوں کو جو اس ملازمت میں بھرتی ہوں پہلے خاص طریقہ سے تربیت دیتا ہے پھر اُن سے جہاد اور حکومتِ الٰہی کی خدمت لینا چاہتا ہے"[۵]

عبادت کا اس خوفناک حد تک مادی نظریہ یقیناً دنیا کے کسی مذہب نے کبھی پیش نہیں کیا مگر جب اقتدار کی بے پناہ تمنا ہر نظریہ حیات پر مسلط ہو چکی ہو تو بعید نہیں رہتا کہ عبادتِ الٰہی بھی فوج، پولیس اور سول سروس کی ٹریننگ کی طرح نظر آنے لگے۔

۵؎ "حقیقتِ جہاد" صفحہ ۱۶ +

اور یہ اقتدار کی تمنا ایسی بے صبر و بے قرار تمنا ہے کہ کسی مشکل اور لمبی (مگر درست) راہ کو اختیار کر کے حصولِ مقصد کی اجازت نہیں دیتی۔ اشتراکیت کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ انقلاب کے لئے لمبے جمہوری طریق کو اختیار کرنا عبث ہے بلکہ کمیونسٹ پارٹی اپنے "نیک مقصد" کے حصول کی خاطر جب بھی موقع پائے حکومتِ وقت کا تختہ اُلٹ کر عنانِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔ مولانا کا بھی بعینہٖ یہی دعویٰ ہے۔ ایک سرِ مُو فرق نہیں۔ چنانچہ مودودی فرمان اپنے متّبعین سے یوں تقاضا کرتا ہے:-

"جس سرزمین میں بھی تمہاری حکومت ہو وہاں خلق خدا کی اصلاح کے لئے اُٹھو، حکومت کے غلط اصول کو صحیح اصول سے بدلنے کی کوشش کرو۔ ناخدا ترس اور شُتر بے مہار قِسم کے لوگوں سے قانون سازی اور فرمانروائی کا اقتدار چھین لو۔[۱]"

حیرت کی بات ہے کہ مولانا اقتدار کی تمنا میں ایک ہزاروں سال کے آزمودہ عام اخلاقی نکتہ کو سمجھنے سے بھی قاصر رہ جاتے ہیں اور وہ نکتہ یہ ہے کہ دعاوی خواہ کتنے ہی بلند بانگ ہوں اور نیّتیں خواہ بظاہر کیسی ہی

---

[۱] "حقیقتِ جہاد" صفحہ ۱۵؛

نیک کیوں نہ ہوں ملک کی کسی پارٹی کو لڑ کر حکومت پر قبضہ کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ورنہ دُنیا میں ایک ایسا فسادِ عظیم برپا ہو جائیگا کہ تاقیامت ہمٹ نہ سکے گا اور خانہ جنگیوں کی ایسی آگ بھڑکے گی کہ بُجھائے نہ بُجھے گی۔

اوّل تو اِس امر کا فیصلہ کہ جس مقصد کے لئے کوئی پارٹی کھڑی ہوتی ہے وہ نیک ہے بھی یا نہیں خود اسی پارٹی پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ دوسرے اگر بالفرض اُسے نیک تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس فیصلہ کا اختیار بھی اُسی پارٹی کو نہیں دیا جاسکتا کہ برسرِ اقتدار لوگ تو سارے بدکردار، نابکار، ناخدا ترس اور شریر ہیں مگر اُس پارٹی کے سارے افراد نیک اور صالح ہیں اور اُن کے دلوں کی نیتیں سیدھی اور صاف ہیں۔ اور اگر ان نیتوں کو نیک بھی تسلیم کر لیا جائے تو اِس خطرہ کا کیا علاج کہ بعض اوقات ابتداءً تو نیتیں نیک ہی ہوتی ہیں یا انسان اِس غلط فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ نیک ہیں:۔

"لیکن حکومت اور فرمانروائی جیسی کچھ بدبلا ہے ہر شخص اُس کو جانتا ہے۔ اُس کے حاصل ہونے کا خیال کرتے ہی انسان کے اندر لالچ کے طوفان اُٹھنے لگتے ہیں۔ خواہشاتِ نفسانی یہ چاہتی ہیں کہ زمین کے خزانے اور خلقِ خدا کی گردنیں اپنے ہاتھ میں آئیں تو دل کھول کر خدائی

کی جائے"۔[1]

پس جب خود مولانا کو بھی یہ تسلیم ہے کہ اقتدار کی تمنّا تو خیر الگ رہی اُس کے حاصل ہونے کا خیال ہی ایک نہایت خطرناک تبدیلی دل میں پیدا کر سکتا ہے تو پھر اِس امر کی کیا ضمانت ہے کہ اُن کے تیار کردہ "صالحین" اِس خطرناک مقام سے محفوظ گزر جائیں گے۔ اگر کہیں کہ اُن کی نیک نیّتی کی ضمانت اِس وجہ سے لی جا سکتی ہے کہ وہ اس ٹرینِنگ میں سے گزر چکے ہوں گے جو اس "سول سروس" کے لئے اللہ تعالےٰ نے مقرر فرمائی ہے۔ یعنی تمام عباداتِ اسلامی بجالانے والے ہوں گے۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا نے یہ فرض کہاں سے کر لیا کہ صرف اُن کی "اسلامی جماعت" کے اراکین ہی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے فرائض ادا کرتے ہیں؟ اگر احمدیوں کی عبادتیں آپ کے نزدیک عبادتیں نہ بھی ہوں تو کیا بریلوی کلیۃً اِن عبادات کے تارک ہیں یا دیوبندی اِن سے بیزار ہو چکے ہیں؟ کیا شیعہ خیال کے مسلمانوں کی عبادتیں عبادتیں نہیں اور اہلِ قرآن ان کو یکسر ترک کر بیٹھے ہیں؟ پھر اِن سب کو کیوں حق نہیں پہنچتا کہ وہ بھی اپنے اپنے رنگ میں بزورِ شمشیر ہر وقت اُس حکومتِ وقت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کرتے رہیں جو اُنکے

---

[1] "حقیقتِ جہاد" صفحہ ۵ ÷

مکتبِ خیال کے مطابق فاسد نظریات پر مبنی ہو۔ پھر غیر مسلم بھی تو اپنی اپنی جگہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ سمجھتے تو کیا فوج در فوج اسلام میں نہ داخل ہو جاتے ؟ اس لئے اُن کو بھی اصولاً یہ حق ملے گا کہ حکومتِ وقت کا تختہ اُلٹنے کے لئے ہر وقت ریشہ دوانیوں میں مصروف رہیں۔

نیک ارادوں یا اصلاحِ خلق کے بہانے صالحین کی مختلف پارٹیوں کو حکومتوں کا تختہ اُلٹنے کی ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی۔ کسی کی صالحیت کے بارہ میں اُن کے اختلافات ایسے شدید اور سنگین ہو سکتے ہیں کہ اگر دونوں کو تسلیم کر لیا جائے تو کوئی پارٹی بھی صالح نہ رہے۔ اِسی مثال پر غور کیجئے کہ مولانا کے نزدیک احمدیت کا اسلام سے کوئی بھی تعلق نہیں۔ یہ اُمتِ محمدیہ میں فساد برپا کرنے کے لئے انگریزوں کا خود کاشتہ پودا ہے جو اُنہوں نے اس غرض سے لگایا تھا کہ مسلمانوں کو جہاد سے متنفّر کیا جائے اور اُن کی قوتِ عمل کو زائل کر دیا جائے۔ احمدیت کا بیج اس لئے بویا گیا ہے کہ مسلمانوں میں باہم اختلافات پیدا کر دیئے جائیں اور مارِ آستین کی طرح یہ جماعت اسلام میں شامل ہو کر ایک خفیہ مگر سخت مہلک حملہ کے ذریعہ اسلام کی بیخ کنی کر دے۔

مگر میرے نزدیک جماعتِ احمدیہ خالصۃً اسلام کے غلبہ اور احیائے نو کی خاطر قائم کی گئی ہے۔ اس کا بیج انگریز نے نہیں بلکہ خود اس خدا نے اپنے

ہاتھ سے بویا ہے جس نے اُمّتِ محمدیہ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی اصلاح کے لئے ایک مہدی عطاء کرے گا اور ایک ایسا مسیح نازل فرمائے گا. جو (اپنے ناقابلِ تردید دلائل کے ذریعہ) صلیب کو پارہ پارہ کردے گا۔ پس میرے نزدیک یہ جماعت اُسی مہدی اور مسیح کی جماعت ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو یہ بنی نوع انسان کی اصلاح کی غرض سے بے غرضانہ اور درویشانہ وعظ و نصیحت کے کام میں مصروف ہے اور دوسری طرف زمین کے کناروں تک عیسائیت سے مصروفِ پیکار ہے اور ہر میدان میں اُسے شکست دے رہی ہے۔ مَیں بھلا کس طرح باور کروں کہ یہ انگریز کا خود کاشتہ پودا ہے۔ کیا انگریز کے خود کاشتہ پودے کا یہی کام تھا کہ وہ انگریز کے مذہب یعنی عیسائیت کے پودے کی بیخ کنی کردے اور ہر سرزمین سے اس کی جڑیں اُکھاڑ پھینکے۔ جہاں جہاں یہ پہنچے تثلیث کے پودے سوکھنے لگیں اور توحید کے بیج بوئے جائیں۔ یہ بیج سرسبز اور شاداب لہلہاتی ہوئی کونپلوں کی صورت پھوٹیں اور جلد جلد بڑھنے لگیں۔ تنومند اور جوان ہوں اور پھولیں اور پھلیں۔ ان کے پھول حسین اور معطر ہوں پھل خوش منظر اور میٹھے۔ اور سبز شاخوں کے سائے تسکین بخش ہوں۔ سعید رُوحیں پرندوں کی طرح اُن کی ڈالی ڈالی پہ وحدت کے گیت گائیں۔ اگر انگریز کے خود کاشتہ پودوں نے یہی کام سرانجام دینے تھے تو کاش ـــــ مَیں سوچتا ہوں کہ انگریز اپنے دورِ

حکومت میں ان صفات کے اور بھی دو چار خود ساختہ پودے لگا جاتے تاکہ اسلام کل زندہ ہونے کی بجائے آج زندہ ہو جاتا اور عیسائیت کل مرنے کی بجائے آج مر جاتی۔

اب دیکھئے کہ احمدیت کے بارہ میں میرا یقین اور ایمان اُس فتویٰ سے کتنا مختلف ہے جو مولانا مودودی اس جماعت کے بارہ میں صادر فرماتے ہیں۔ مَیں تو اس جماعت کی عمارت کو اس گہرے عشق پر قائم دیکھتا ہوں جو غیر متزلزل طور پر اس جماعت کے بانی کے دل میں خدا اور اُس کے رسولؐ کے لئے جاگزیں تھا اور جس کا اظہار آپؑ اپنے ایک شعر میں اس طرح فرماتے ہیں کہ:۔

بعد از خدا بعشقِ محمدؐ مخمرم
گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

"مَیں تو خدا کے بعد محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عشق میں مخمور ہوں۔ اگر کفر یہی ہے تو خدا کی قسم مَیں سخت کافر ہوں۔"

مگر مولانا کے نزدیک اِس جماعت کی بنیادیں سرزمینِ انگلستان میں گڑی ہوئی ہیں۔ کیا کوئی بھی نسبت ہے اِن دونوں اعتقادات میں؟

پھر اِس مثال کو اُلٹا کر اِس طرح بھی ملاحظہ فرمالیجئے کہ مولانا کے نزدیک "جماعتِ اسلامی" اس لئے قائم کی گئی ہے کہ "صالحین" کی ایک جماعت تیار کی

جائے جو اسلامی عبادات کو لمبے عرصہ تک نہایت سختی کے ساتھ ادا کرنے کے بعد اس قابل ہو جائے کہ اسلام اُن سے کہہ سکے کہ :-

"ہاں اب تم رُوئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے ہو۔ لہٰذا آگے بڑھو۔ لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو"

چنانچہ مولانا کی کوششوں سے رُوئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح" بندوں کی جماعت تیار ہو چکی ہے اور اب صرف اس بات کا انتظار ہے کہ کب اتنی طاقت پیدا ہو کہ" لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل" کر کے "حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں" لے لئے جائیں۔

مولانا سمجھتے ہیں کہ یہ جماعت خالصتہً دنیا کی اصلاح اور اسلام کا بول بالا کرنے کی غرض سے قائم کی گئی ہے تاکہ غیر اللہ کا تصور مٹا دیا جائے اور بزورِ شمشیر سروں کو خدا کی عظمت کے سامنے خم کر دیا جائے۔

مگر میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ یہ بالکل غلط اور بے بنیاد بات ہے کہ مودودی جماعت کے اراکین" رُوئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے" ہیں۔ میرا یہ ایمان ہے کہ اگرچہ ہمیں یہ حق تو حاصل ہے کہ ہم عقائد کی رُو سے کسی جماعت یا مذہب کے متعلق یہ فیصلہ کریں کہ وہ حق و صداقت

پر مبنی ہے مگر ہمیں یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ اس دنیا میں اپنے متعلق یہ فتوے دیں کہ ہم نیک اور صالح ہیں سوائے اس کے کہ صالحیت کے غیر مشکوک آثار ظاہر ہوں اور اللہ تعالیٰ کے پیار کی علامات نظر آنے لگیں جس طرح وہ پہلے اپنے پیارے صالحین سے ہمکلام ہوتا رہا ہے اب بھی ہم کلام ہو۔ جس طرح وہ پہلے اُمت کے صوفیاء اور بزرگان پر ظاہر ہوتا رہا ہے اب بھی دعویداران صالحیت پر ظاہر ہو۔ اُن کی نصرت فرمائے اور اپنی قولی اور فعلی شہادت سے یہ بات ثابت فرما دے کہ صالحیت کا دعویٰ کرنے والے واقعی صالح ہیں۔ ورنہ انسان ریاکاری اور خوش فہمیوں کے چکر میں ایسا پھنسا ہوا ہے کہ اُسے خود اپنے نفس ہی کی خبر نہیں۔ وہ خدا ہی بہتر جانتا ہے جو دلوں کے ہر راز سے واقف ہے اور فطرتِ انسانی کے پاتال تک کی خبر رکھتا ہے کہ کون صالح ہے اور کون غیر صالح ہے۔

پس میرے نزدیک مودودی صاحب کا یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے اور یہ بھی بالکل غلط ہے کہ "جماعتِ اسلامی" اسلام کا بول بالا کرنے کے لیے قائم کی گئی ہے۔ کیونکہ اگر اِس جماعت کے وہی عقائد ہیں جو مولانا مودودی کے ہیں تو یہ اسلام کا بول بالا نہیں کر رہی بلکہ اسلام کو دنیا کی نظروں میں حقیر کر رہی ہے اور طبیعتوں کو اِس پاک مذہب سے سخت متنفر کر رہی ہے۔ پاکستان کی ایک مسلمان اکثریت کے ماحول میں بیٹھے ہوئے مولانا مودودی

اسلام کے بول بالا ہونے کے جس قدر نعرے چاہیں لگالیں مگر ذرا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی "اشاعتِ اسلام" اور آپ کی "پالیسی" کے بارہ میں اپنے نظریات لے کر غیر اسلامی ملکوں میں تبلیغ کے لئے تو نکل کر دیکھیں خوب کھل جائے گا کہ اِن نظریات سے اسلام کا کس قدر بول بالا ہو رہا ہے۔

ذرا اِس عقیدہ کو ہاتھ میں لیکر کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی تک آسمان پر زندہ موجود ہیں کسی عیسائی ملک کو اسلام کی طرف بلا کر تو دیکھیں اور اِس ہتھیار سے کسرِ صلیب کی کوشش تو کریں۔ پھر میں اُن سے پوچھوں گا کہ بتایئے یہ مودودی نظریات اسلام اور اُس کے مقدس رسولؐ کے نام کا بول بالا کر رہے ہیں یا صورت برعکس ہے۔

سچ یہی ہے اور اِسی پر میرا ایمان ہے کہ اِن نظریات سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخت ہتک لازم آتی ہے۔ اس لئے میں مودودی جماعت کو ہرگز اسلام کا دوست نہیں سمجھتا۔ صرف یہی نہیں بلکہ مجھے اِس جماعت میں اور اِس کے طریق کار میں اشتراکیت کی بُو آتی ہے اور اس کا بیج سرزمینِ روس میں بویا ہوا دکھائی دیتا ہے اور روحانیت کا کلی فقدان نظر آتا ہے۔

اب دیکھ لیں کہ ہمارے دعاوی ہمیں اپنی نظر میں کتنے معصوم اور کتنے نیک دکھائی دیتے ہیں مگر جب ایک دوسرے کی نظر سے ان کو دیکھیں تو.......... الامان والحفیظ!——

اِس مثال کو اگر اُمت کے باقی فرقوں پر پھیلا دیا جائے اور ہر ایک کا ہر ایک سے اِسی طرح موازنہ کیا جائے تو اس نظریہ کی قلعی کھُل جائیگی کہ انسانوں کی اصلاح کی خاطر اور فساد اور ظلم اور طغیان کو دنیا سے دُور کرنے کے لیے لڑ کر حکومت پر قبضہ کرنا جائز ہے۔

مَیں جب اِس مودودی نظریہ کو دیکھتا ہوں تو مجھے انگریزی کا وہ مقولہ یاد آجاتا ہے کہ :۔

"جہنم کا راستہ نیک نیتوں کی اینٹوں سے بنا ہوُا ہے"۔

اور آخری حتمی فیصلہ طلب کرتے ہوئے جب مَیں قرآن کریم پر نظر دوڑاتا ہوں تو اس آیت پر نظر ٹھہر جاتی ہے کہ:۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ۝ (البقرہ ع ۲)

"جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں ہم تو مصلحین کی جماعت ہیں۔ خبردار! یہی فسادی ہیں مگر جانتے نہیں۔"

اللہ اللہ! کتنا پیارا کلام ہے اور اس چھوٹے سے کلمہ میں کیسی کیسی ابدی صداقتیں بھری ہوئی ہیں۔ اِس آیت کا ایک ایک جزء اپنے

اندر فطرتِ انسانی کے گہرے راز لئے ہوئے ہے۔

جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں ہم تو مصلحین کی جماعت ہیں۔ خبردار! یہی فسادی ہیں مگر جانتے نہیں!

قتلِ مُرتد

مودودی نظر میں

مولانا کی حصولِ اقتدار کی تمنّا ہر قید و بند سے آزاد ہے اور ہر میدان میں اُن کی متشدّد طبیعت کے پہلو بہ پہلو جولانی دکھاتی ہے۔ اُن کا قتلِ مُرتد کا عقیدہ بھی اِسی کا کھلایا ہوُا ایک گُل ہے اور اپنے مخصوص طریق کے مطابق یہ اس عقیدہ کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ چنانچہ اِس موضوع پر ایک رسالہ "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں" قلمبند فرمایا ہے جس میں نہایت دلیری سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف اِس نظریہ کو منسوب کیا ہے اور حضرت ابوبکرؓ کی اُس فوج کشی سے نظیر پکڑی ہے جو آپ نے منکرینِ زکوٰۃ کی بغاوت کو فرو

کرنے کے لئے فرمائی تھی۔ جہاں تک مولانا کے پیش کردہ "نقلی" اور "عقلی" دلائل پر تفصیلی بحث کا تعلق ہے یہ امر ایک علیحدہ کتاب کا متقاضی ہے۔ پس میں یہاں اُس کے چند ایک پہلوؤں کے ذکر پر ہی اکتفا کروں گا۔

اگرچہ یہ درست ہے کہ اور بھی علمائے اسلام نے جو یقیناً نیک دل اور صاف نیّت تھے اِس مسئلہ میں ٹھوکر کھائی ہے مگر اُن کی ٹھوکر اور مولانا مودودی کی ٹھوکر میں ایک بھاری فرق ہے اور میں پہلے اُسی فرق کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اُن علماء کی غلطی محض ایک فقہی غلطی تھی اور اُن کے نفس کے تشدد کا اُس میں کوئی دخل نہ تھا۔ چنانچہ باوجود اِس کے کہ وہ دیانت داری سے اِس بات کے قائل تھے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے اُن کے ہاں مسلمان کی تعریف ایسی وسیع تھی کہ اُس سے اُمتِ محمدیہ میں کسی قتلِ عام کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اور اِس حکم کا اطلاق اُسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے مذہب سے آکر اسلام میں شامل ہو، پھر مرتد ہو جائے اور واضح طور پر کہے کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔ اِس پر بھی خود اِس نظریہ کے حامل علماء میں سے بعض کا یہ فتویٰ تھا کہ ایسے شخص کو توبہ کے لئے غیر معیّن مدّت تک مہلت دینی چاہیئے۔ اِس سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اُن کی یہ غلط فہمی اِس خواہش کی بناء پر نہ تھی کہ خلقِ خدا کی گردنیں اُن کے ہاتھ میں آجائیں اور وہ دل کھول کر خدائی کریں۔ ہرگز

اُنہیں یہ ذوق وشوق نہیں تھا کہ وہ زبردستی پہلے کلمہ گو مسلمانوں پہ کُفر کے فتوے لگا کر اُنہیں کافر قرار دے لیں پھر قتلِ مُرتد کا عقیدہ دامن میں لے کر تاک لگائے بیٹھے رہیں کہ کب اقتدار ہاتھ میں آئے اور کب ہم مرتدّین کے خون کے دریا بہا دیں۔

مگر یورپ کی تاریک صدیوں کے راہنمایانِ مذاہب کی طرح جن کے نزدیک عیسائیت سے ارتداد کی سزا قتل تھی اور عیسائیت سے مُراد وہ عیسائیت تھی جو اُن کے مکتبِ خیال کے مطابق ہو۔ مودودی صاحب کے نزدیک بھی اِسلام سے اِرتداد کی سزا قتل ہے اور اسلام سے مُراد وہ اسلام ہے جسے مودودی صاحب یا اُن کے کوئی جانشین اسلام قرار دیں۔ چنانچہ مودودی "دَورِ حکومت" میں اِس امر کا آخری فیصلہ بہرحال کسی مودودی حکمران ہی کے ہاتھ میں ہوگا کہ کون مسلمان اور کون مُرتد کے حکم میں آتا ہے۔ یہ فیصلہ کیا ہوگا؟ اِس سوال کا جواب غیر مشکوک طور پر مولانا کی تصنیفات میں دیا جا چکا ہے۔

مگر اِس بارہ میں مولانا کے تصوّرات قلمبند کرنے سے پہلے مَیں ضروری سمجھتا ہوں کہ حتّی الامکان اختصار کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس الزام سے بریّت ثابت کردوں کہ نعوذ باللہ آپ بھی اِس عقیدہ کے قائل تھے کہ اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنے کی سزا اسلامی قانون میں

قتل ہے۔

اگر کسی شخص کی طرف کوئی خیال یا فعل منسوب کیا جائے تو طبعاً دل میں ایک سوال اُٹھتا ہے کہ کیا وہ دعویٰ یا فعل اُس شخص کے معلوم اخلاق اور شمائل کے مطابق ہے یا نہیں۔ اِس کسوٹی پر ہم بہت سے امور کو روزمرہ کی زندگی میں پرکھتے ہیں اور اس کا اطلاق صرف انسان پر ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر چیز پر ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی آپ سے کہے کہ مَیں نے جنگل میں ایک گھوڑا دیکھا جو شیر کو چیر پھاڑ کر کھا رہا تھا۔ یا ہرن کا ایک بچہ دیکھا جس نے دیکھتے دیکھتے ایک چیتے پر حملہ کر کے اُس کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑا دیئے تو آپ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ باور نہیں کر سکتے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا کیونکہ یہ دعویٰ گھوڑے اور ہرن کی معلوم خصلت کے صریحاً خلاف ہے۔ اِسی طرح یہ قتلِ مرتد کا عقیدہ ظاہراً ایک ایسا غیر طبعی اور غیر منصفانہ فعل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی طرف اِس نظریہ کو بہرحال منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ آپؐ کا تو پیغام ہی یہی تھا کہ دنیا والے اپنے تمام مذاہب چھوڑ کر آپؐ کا مذہب قبول کر لیں پھر آپؐ خود کس طرح تبدیلیٔ مذہب پر کسی قسم کے جبر کو روا رکھنے کی اجازت دے سکتے تھے۔ جب لوگ کوئی دوسرا مذہب چھوڑ کر آپؐ کے مذہب میں داخل ہوتے تھے اور اس جُرم کی پاداش میں اُن کو مارا یا ستایا جاتا تھا تو آپ اسے صریح ظلم قرار دیتے تھے اور انسان کی آزادیٔ ضمیر کے خلاف ایک سخت غیر منصفانہ دسترس

سب سمجھتے تھے پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ سب عادل انسانوں سے بڑھ کر عدل کرنے والا اور سب منصفوں سے زیادہ منصف مزاج اپنے معاملہ میں اِس معیار کو بالکل فراموش کر ڈالے۔ جب لوگ کسی کو تبدیلیٔ مذہب پر ماریں تو انہیں سخت ظالم قرار دے اور جب اپنا مذہب چھوڑ کر کوئی دوسری طرف جائے تو اُس کے قتل کا فتویٰ جاری کرے۔ اس قسم کی پالیسی تو کسی دنیا کے سیاست دان کی طرف منسوب کرنا بھی اُس کی سخت ہتک سمجھی جاتی ہے کجا یہ کہ اسے سب نبیوں کے سردار حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کیا جائے۔ اس کے علاوہ اگر آپؐ کے عمومی خلق کی طرف بھی جس کی بعض جھلکیاں پہلے گذر چکی ہیں، نگاہ کی جائے تو اس عقیدہ کو آپؐ کی طرف منسوب کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ جس طرح سورج کے متعلق خواہ ہزار دلائل دیئے جائیں، کوئی یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ وہ روشنی کی بجائے تاریکی برساتا ہے اُسی طرح اُس انسانِ کاملؐ کی طرف یہ غیر فطری فعل منسوب کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ یہ سرے سے ناانصافی ہے ہی نہیں تو اِس کا جواب میرے پاس سوائے ایک سخت حیران خاموشی کے اَور کچھ نہیں۔

دوسرا امر قابلِ غور یہ ہے کہ قرآن کریم جو مذاہب کی تاریخ پیش کرتا ہے اُس پر ایک نظر ڈالنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ انبیائے گزشتہ میں سے ایک نے بھی کبھی اِرتداد کی سزا موت یا جلاوطنی تجویز نہیں کی۔ اِسکے برعکس

بلا استثناء ان کے تمام مخالفین نے ارتداد کی سزا موت یا جلا وطنی تجویز کی اور اسی کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں اُن کے اس طریق کو سخت ناپسندیدہ اور قابلِ سرزنش قرار دیتا ہے اور اس کی سزا یقینی ہلاکت اور عتابِ الٰہی تجویز فرماتا ہے۔ پھر میں یہ کس طرح تسلیم کر لوں کہ میرے مقدس آقا نے اُن تمام معصوم انبیاء کی سُنّت کو ترک کر کے نعوذ باللہ اُن کے مخالفین کی ناپسندیدہ اور ناجائز سنّت کو اپنا لیا اور اُسی کو صحیح قرار دیا۔ یہ میرے نزدیک سورج کی طرف تاریکی منسوب کرنے سے بھی زیادہ ناممکن ہے۔ مگر اس پہلو پر چونکہ کتاب کے پہلے باب ہی میں نہایت تفصیل سے روشنی ڈال دی گئی ہے اس لئے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

تیسرا فیصلہ کُن امر یہ ہے کہ قرآن کریم حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ کی جو تاریخ پیش کرتا ہے وہ واضح طور پر اس خیال کو باطل اور بے بنیاد قرار دے رہی ہے۔ اور آنحضرتؐ کے زمانہ کی قرآن کریم کی پیش کردہ تاریخ کے متعلق مسلمان علماء تو کیا تمام یورپین مستشرقین بھی خواہ کیسے ہی متعصب کیوں نہ ہوں یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ یہ بغیر کسی شک کے قابلِ قبول ہے۔ قرآن کریم کے پیش کردہ جن تاریخی حقائق کی طرف مَیں نے اشارہ کیا ہے اُن کا تفصیلی ذکر انشاء اللہ اس باب کے آخر پہ کیا جائے گا۔ بہر حال یہ تینوں دلائل اکیلے اکیلے بھی ایسے وزنی اور ٹھوس اور واضح ہیں کہ ان کے مقابل پہ

ہر دوسری دلیل ٹھکرائی جانے کے لائق ہے۔ اور امور کو چھوڑ کر صرف آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی صفتِ انصاف پر ہی نظر کی جائے تو قتلِ مرتد کے نظریہ کی عمارت ریت کے قلعہ کی طرح خود بخود مسمار ہو جاتی ہے۔ مودودی صاحب اگر اس کے مقابل پر یہ دلیل پیش فرمائیں کہ بہت سے جیّد علمائے اسلام اس نظریہ کے قائل تھے تو مولانا کے اس استدلال کو میں ایسا ہی سمجھتا ہوں جیسے کوئی شاخ کو اوّل اور جڑ کو آخر کر دے۔ یہ علماء خواہ کتنے ہی بڑے مقام پر کیوں نہ ہوں پھر بھی امورِ شرعیہ میں غلطی سے پاک نہیں تھے مگر ہمارے آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم غلطی سے پاک تھے اس لئے اگر چودہ سو سال میں مختلف اوقات میں پیدا ہونے والے تمام علماء بھی بیک آواز کوئی ایسی بات کہیں جسے تسلیم کر لینے سے حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صداقت، امانت، دیانت اور عدالت پر کوئی حرف آتا ہو تو میں اُسے تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ علماء اپنے اعلیٰ اور بلند مرتبوں کے باوجود ٹھوکر کھا سکتے ہیں اور کھاتے رہے ہیں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صفاتِ حسنہ غیر مشکوک ہیں۔ اِن علماء کے شدید باہمی اختلافات ہی اِس امر کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ یہ خطاء سے پاک نہ تھے۔ اگر دس رائیں ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو بہر حال ایک ہی درست ہوگی اور باقی تو غلط ہوں گی بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک بھی

درست نہ ہو۔ بہرحال قطع نظر اِس سوال کے کہ علماء کہیں انفرادی یا اجتماعی ٹھوکر کھا سکتے ہیں یا نہیں ایک امر جو ہر شک سے بالا ہے اور یقیناً درست ہے وہ یہی ہے کہ شاخوں کو جڑ پر قربان کیا جا سکتا جڑ کو شاخوں پر نہیں۔ کوئی حدیث جس کے راوی خواہ کتنے ہی سچے ہوں اگر قرآن کریم کی کسی آیت کے یقینی طور پر خلاف ہو تو قرآن کریم کے مقابل پر اُسے بہرحال ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ اسی طرح ہر وہ اجماع یا کثرت رائے جو قرآن کریم کے کسی بیان کے یقینی طور پر خلاف ہو یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اخلاقِ حسنہ پر بُرے رنگ میں روشنی ڈالے بغیر کسی تردّد کے معاً ٹھکرا دینے کے قابل ہے۔

اس مختصر بحث کے بعد اب ہم مضمون کے اُس حصّہ کی طرف واپس لوٹتے ہیں جہاں ہم نے تسلسل کو توڑا تھا۔ سوال زیرِ بحث یہ تھا کہ مودودی صاحب کے نزدیک مسلمان کہلانے والوں کے اس انبوہِ کثیر میں سے کون کون سے فرقے مرتد شمار ہوں گے تاکہ اِس امر کا کچھ اندازہ کیا جا سکے کہ اگر کبھی انہیں اقتدار نصیب ہو تو خلقِ خدا میں سے کتنوں کی گردنیں اُن کے ہاتھ میں آ جائیں گی۔

مولانا کے نزدیک احمدی تو خیر "مرتد" ہیں ہی اور بہرحال ایک "غیر مسلم اقلیت" ہیں لیکن یہ ارتداد اور کفر محض انہی تک محدود نہیں، ان کے علاوہ اہلِ قرآن یعنی پرویز صاحب کے مکتبِ خیال کے لوگ بھی غیر مشکوک طور پر کافر، دائرہ اسلام سے خارج یا بالفاظِ دیگر مرتد متصوّر ہوں گے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔

اُن کا کُفر "قادیانیوں" سے بھی زیادہ سنگین شمار ہوگا۔ (اِس لحاظ سے ممکن ہے اُنہیں نسبتاً زیادہ تکلیفیں دے کر مارا جائے) چنانچہ جماعتِ اسلامی کے ترجمان "تسنیم" میں شائع ہونے والا مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کا ایک فتویٰ ملاحظہ فرمائیے۔ یہ فتویٰ اُن دنوں کا ہے جب ابھی مولانا امین احسن اصلاحی مودودی صاحب سے برگشتہ نہیں ہوئے تھے اور اُن کا دایاں بازو شمار ہوتے تھے۔ مولانا اصلاحی صاحب فرماتے ہیں ۔

"بعض لوگ اسلامی شریعت کے اختلافات کا حوالہ دیکر مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اِس ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کا تو کوئی امکان نہیں ہے البتہ قرآن کریم کے اصولوں پر اِس ملک میں حکومت قائم کرو۔ اگر یہ مشورہ دینے والوں کا مطلب یہ ہے کہ شریعت صرف اتنی ہی ہے جتنی قرآن میں ہے باقی اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ شریعت نہیں ہے تو یہ صریح کُفر ہے اور بالکل اُسی طرح کا کُفر ہے جس طرح کا کُفر قادیانیوں کا ہے بلکہ کچھ اُس سے بھی سخت اور شدید ہے[1]"

---

[1] ماخوذ از "مزاج شناسِ رسولؐ" صفحہ ۳۵۲ بحوالہ "تسنیم" ۱۵ اگست ۱۹۵۲ء۔

چلئے احمدیوں اور اہلِ قرآن کا جھگڑا تو نپٹا لیا گیا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کُفر اور ارتداد بس اِنہی دو فرقوں پر ختم ہو جاتا ہے؟ تو اِس سوال کی تحقیق میں ہم جوں جوں مودودی لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں یہ حقیقت کُھلتی چلی جاتی ہے کہ مودودیت کے سوا مودودی نگاہ میں ہر دوسری چیز کُفر ہی کُفر ہے۔ چنانچہ "مسلمانوں" کے "مسلمان فرقوں" کا حال دیکھتے ہیں کہ مودودی صاحب کے نزدیک اُن کا اسلام کتنے پانی میں ہے۔ اِس انبوہِ کثیر پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

"یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر اسے تسلیم کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ اِن کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ اُمید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستہ پر چلے گی تو اُس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے[1]"

---

[1] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۱۳۰۔

پھر فرماتے ہیں :۔

"جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے دُودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر دُودھ زہریلا ہو تو اُس سے جو مکھن نکلے گا قدرتی بات ہے کہ وہ دُودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا.......پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلّط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اِس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔"[۱]

اگر ابھی تک غیر مودودی "مسلمانوں" کے متعلق مولانا کے فتوے کی وضاحت نہ ہوئی ہو تو مزید وضاحت کی غرض سے ایک اور اقتباس پیش ہے :۔

" یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ

---

[۱] "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص۱۳۲

کافروں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اُسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت، چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفّار سے کچھ کم نہیں ہے[۵]۔"

کیا اِن فتووں کے بعد بھی کسی مزید کُفر کے فتویٰ کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ اگر رہتی ہے تو شاید اِس خیال سے کہ یہ فتویٰ عامّۃ الناس یعنی ۹۹۹ فی ہزار کے متعلق ہوگا مسلمان علماء اور دیگر زعماء پر چسپاں نہیں ہوسکتا۔ مگر یہ خیال درست نہیں کیونکہ مودودی صاحب کی نظر میں ہر غیر مودودی ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جانے کے لائق ہے:۔

"خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علمائے دین و مفتیانِ شرع دونوں قسم کے راہنما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گُم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہِ حق سے ہٹ کر

---

[۵] "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصّہ سوم ص۱۲۶"۔

تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ اُن میں سے کسی کی نظر بھی مسلمانوں کی نظر نہیں[۵]۔"

قارئین کرام خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ اگر راہِ حق سے ہٹ جانے کا نام اِرتداد نہیں تو اَور کیا ہے؟

مودودی صاحب کے مندرجہ بالا دونوں فتوے پڑھ کر مجھے وہ کہانی یاد آجاتی ہے کہ کسی بادشاہ کو ایک گھوڑا بہت عزیز تھا۔ وہ بہت بیمار ہو گیا۔ بادشاہ کو کہاں برداشت تھی کہ اُس کی موت کی خبر سُنے۔ حکم دے دیا کہ جو بھی یہ منحوس خبر سُنائے گا مارا جائے گا۔ مگر ساتھ ہی اس کا بھی پابند کر دیا کہ ہر آدھ گھنٹہ کے بعد صحت کی اطلاع بھجواتے رہو۔ گھوڑا مشیتِ ایزدی سے آدھ گھنٹہ کے اندر مر گیا اور افسروں نے پکڑ پکڑا کر ایک شخص کو یہ خبر سُنانے کے لئے بھجوا دیا۔ اُس نے جا کر دست بستہ عرض کی کہ حضور گھوڑا بڑے آرام میں ہے۔ کوئی درد محسوس نہیں کرتا۔ کوئی حرکت نہیں کرتا۔ کوئی آواز نہیں نکالتا۔ اُس کو سانس نہیں آتا۔ اُس کا دل نہیں چلتا۔ بادشاہ نے تلملا کر کہا پھر یہ کیوں نہیں کہتے کہ مر گیا۔ تو اُس شخص نے جواب دیا کہ دیکھئے یہ حضور ہی فرما رہے ہیں۔ مَیں نے تو نہیں کہا۔

---

[۵] روئداد جماعتِ اسلامی حصہ اوّل ص۲؎

پس اگر کوئی قوم گم کردہ راہ ہو۔ راہِ حق سے ہٹ چکی ہو۔ تاریکیوں میں بھٹک رہی ہو۔ اس کی نظر مسلمان کی نظر نہ رہی ہو۔ جتنے ٹائپ کافروں میں پائے جاتے ہوں اس میں پائے جاتے ہوں تو اس قوم کو کافر نہیں تو اور کیا کہا جائے گا؟ مگر شاید مودودی صاحب کہہ دیں کہ دیکھو تم ہی کہہ رہے ہو میں تو نہیں کہتا۔

اس لئے اب بھی اگر کسی کو یقین نہ آئے کہ ایسا ہونا ممکن ہے تو جماعتِ اسلامی سے الگ ہو جانے والوں کے متعلق اِرتداد کا فتویٰ اس کی تسلی کے لئے کافی ہو گا:۔

"یہ وہ راستہ نہیں ہے جس میں آگے بڑھنا اور پیچھے ہٹ جانا دونوں ایک ہوں۔ نہیں۔ یہاں پیچھے ہٹ جانے کے معنے ارتداد کے ہیں[1]"

پس اگر جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہو کر کسی دوسری جماعت میں شامل ہو جانے کا نام "ارتداد" ہے تو دوسری جماعت کا نام "کفر" نہیں تو اور کیا ہو سکتا ہے؟

لیکن اگر میں غلط کہہ رہا ہوں تو مودودی صاحب ہی درست فرمائیں کہ

---

[1] "رودادِ جماعت اسلامی" حصہ اوّل ص۳ ؎

وہ اُن مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عالم الغیب مانتے ہیں اور آپ کے مادی جسم کا انکار کرتے ہیں۔ اور اُن مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں جن کے نزدیک اولیاء اللہ کی قبروں پر جا کر اُن سے مرادیں مانگنی جائز ہیں۔ اور وہ اُن مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ باقی سب خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو غاصب کہتے ہیں اور اُن پر اور دیگر صحابہؓ پر بشمولیت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تبرّا بھیجتے ہیں اور لعنتیں ڈالتے ہیں۔

ویسا جواب نہ دیں جیسے گھوڑے کے مرنے کی خبر دی گئی ہے بلکہ بادشاہ کے الفاظ میں بتائیے کہ ان کو کیا کہتے ہیں۔

پیدائشی مسلمان یہاں پہنچ کر ایک نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مرتد کی سزا قتل ہے اور یہ بھی مان لیا جائے کہ مودودی صاحب کے نزدیک اُن کی جماعت کے سوا باقی سب مسلمان کہلانے والے کافر ہیں تو بوجہ اس کے کہ انہوں نے یہ کفر اپنے ماں باپ سے ورثہ میں لیا ہے خود مولانا کے نزدیک بھی انہیں مُرتد قرار نہیں دیا جا سکے گا بلکہ "پیدائشی کافر" شمار ہوں گے۔ اس لحاظ سے مولانا پر یہ بڑی زیادتی معلوم ہوتی ہے کہ اُن کی طرف یہ عقیدہ منسوب کیا جائے کہ وہ تمام پیدائشی "مسلمانوں" کو جن کے ماں باپ بھی اُن کے نزدیک کافر ہیں بیک وقت کافر بھی سمجھتے ہیں اور مُرتد بھی۔ یہ کس طرح ممکن ہے؟ مجھے خود یہ

تسلیم ہے کہ معقولیات کی دنیا میں ایسا ہونا ممکن نظر آتا ہے لیکن اگر معقولیات کی دُنیا ہی نہ ہو، اگر تشدّد کی پادشاہی ہو اور عام عقلِ انسانی کو مجال نہ ہو کہ وہاں پُھار سکے تو کیا تب بھی ایسا ہونا ممکن نہیں ہے؟ یہاں تو تشدّد کی پادشاہی ہے اور معاملاتِ ملک اس دستور کے مطابق طے پاتے ہیں کہ

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

پس اِس دستور کے مطابق ہر وہ "کافر" جو "مسلمان" کہلاتا ہے اور اپنی قسم کے ہی مسلمان کافروں کے گھر میں پیدا ہوا "مرتد" کہلائے گا، اور واجب القتل ہوگا۔ کیونکہ اگر اُن کے جان و مال پر دسترس حاصل کرنی ہے تو سوائے اِس کے چارہ نہیں رہتا کہ اوّلاً انہیں پیدائشی مسلمان قرار دیا جائے پھر یہ اصرار کیا جائے کہ وہ بالغ ہونے کے بعد خود ہی کافر ہوئے ہیں کیونکہ اُن کے والدین نے اُن کی ایک کافرانہ ماحول میں تربیت کی تھی اس لئے یہ سارے پیدائشی مسلمان "کافر" مرتد ہیں اور واجب القتل ہیں۔

دیکھئے! کیسا عجیب دستور پادشاہی ہے کہ جہاں تک مودودیت اور غیر مودودیّت کا تعلق ہے غیر مودودیّت کُفر ہے مگر جہاں تک اس اختیار کا تعلق ہے کہ ایک پیدائشی کافر مودودیت کے سوا کوئی اور مذہب اختیار کرلے وہ پیدائشی "کافر" "پیدائشی مسلمان" کے حکم میں آجاتا ہے۔

یہ کرشمہ سازی صرف یہیں پر آکر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اگر ایک طرف ایک ایسے "مرتد" کے قتل کا جواز جو پہلے اپنی مرضی سے کفر چھوڑ کر مسلمان ہوا تھا یہ پیش کیا جاتا ہے کہ جب اُسے علم تھا کہ یہ ایک یکطرفہ راستہ ہے اور اس سے واپسی ممکن نہیں تو پہلے مسلمان ہی کیوں ہوا تھا، تو دوسری طرف ایک "پیدائشی مسلمان" سے تبدیلیٔ مذہب کا حق یہ کہہ کر چھین لیا جاتا ہے کہ اگرچہ یہ درست ہے کہ اُس مجبور انسان کا اپنی پیدائش کے حالات پر کچھ اختیار نہیں تھا اور تقدیرِ الٰہی سے بندھا بندھایا ایک مسلمان گھر میں پیدا ہو گیا تھا مگر پھر بھی اُسے تبدیلیٔ مذہب کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ اِس طرح تو بڑی مشکل پڑ جائے گی۔ چنانچہ انہی لاینحل مسائل کی گتھیاں سُلجھاتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:۔

"لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی کو اپنے دین میں آنے کے لئے مجبور نہیں کرتے۔ اور واقعی ہماری روش یہی ہے۔ مگر جسے آکر واپس جانا ہو اُسے ہم پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں کہ یہ دروازہ آمد و رفت کے لئے کھلا ہوا نہیں ہے۔ لہٰذا اگر آتے ہو تو یہ فیصلہ کر کے آؤ کہ واپس نہیں جانا ہے۔ ورنہ براہِ کرم آؤ ہی نہیں۔"

مجھے لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کی یہ تفسیر پڑھ کر اہلِ قرآن کے لیڈر

پرویز صاحب کا وہ فقرہ یاد آجاتا ہے جس میں انہوں نے دوسرے الفاظ میں مودودی صاحب کے اِس نظریہ کو یوں بیان کیا ہے :۔

مودودی صاحب کا اسلام بھی گویا ایک چوہے دان ہے "آتو سکتا ہے چوہا مگر جا نہیں سکتا"۔ (غالباً اُن کی یہی ستم ظریفیاں ہیں جو انہیں مودودی نظر میں اِس قدر مقہور و مغضوب بنا رہی ہیں)

مگر قطع نظر اِس امر کے کہ اِس تفسیر میں مولانا نے اِس آیت کریمہ کا عملاً مذاق اُڑایا ہے اگر کوئی نادان یا مجبور اِس فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے یہ سوال کر بیٹھے کہ درست ہے جو آپ نے فرمایا مگر حضرت —— مَیں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں —— مَیں تو پیدا ہی مسلمانوں میں ہوا تھا مجھے کیا خبر تھی کہ یہ "One way traffic" یعنی یکطرفہ راستہ ہے اور مجھ غریب کو کیا خبر تھی کہ مودودی دَورِ حکومت میں پیدا ہوں گا تو اِس سوال کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں دوہراتے ہوئے مولانا ایک عجیب و غریب جواب دیتے ہیں۔ مولانا کی ساری عبارت درج ذیل ہے :۔

"پیدائشی مسلمان

اِس سلسلہ میں ایک آخری سوال اور باقی رہ جاتا ہے جو قتلِ مرتد کے حکم پر بہت سے دماغوں میں تشویش پیدا کرتا ہے وہ یہ کہ جو شخص پہلے غیر مسلم تھا پھر اُس نے باختیارِ خود اسلام قبول کیا

اور اُس کے بعد دوبارہ کُفر اختیار کرلیا اُس کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اُس نے جان بُوجھ کر غلطی کی۔ کیوں نہ ذمی بن کر رہا اور کیوں ایسے اجتماعی دین میں داخل ہوا جس سے نکلنے کا دروازہ اُسے معلوم تھا کہ بند ہے۔ لیکن اُس شخص کا معاملہ ذرا مختلف ہے جس نے اسلام کو خود نہ قبول کیا ہو بلکہ مسلمان ماں باپ کے گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے اسلام آپ سے آپ اُس کا دین بن گیا ہو۔ ایسا شخص اگر ہوش سنبھالنے کے بعد اسلام سے مطمئن نہ ہو اور اُس سے نکل جانا چاہے تو یہ بڑا غضب ہے کہ آپ اُسے بھی سزائے موت کی دھمکی دے کر اسلام کے اندر رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف ایک زیادتی معلوم ہوتی ہے بلکہ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ پیدائشی مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اسلام کے اجتماعی نظام کے اندر پرورش پاتی رہے۔ اِس شبہ کا ایک جواب اُصولی ہے اور ایک عملی ہے۔ اُصولی جواب یہ ہے کہ پیدائشی اور اختیاری پیرؤوں کے درمیان احکام میں نہ فرق کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی دین نے کبھی ان کے درمیان فرق کیا ہے

ہر دین اپنے پیروؤں کی اولاد کو فطرۃً اپنا پیرو قرار دیتا ہے اور اُن پر وہ سب احکام جاری کرتا ہے جو اختیاری پیروؤں پر جاری کئے جا سکتے ہیں۔ یہ بات عملاً بالکل ناممکن ہے اور عقلاً بالکل لغو ہے کہ پیروانِ دین یا سیاسی اصطلاح میں رعایا اور شہریوں کی اولاد کو ابتداءً کفار یا اغیار کی حیثیت سے پرورش کیا جائے اور وہ بالغ ہو جائیں تو اِس بات کا فیصلہ اُن کے اختیار پر چھوڑ دیا جائے۔ کہ آیا وہ اس دین کی پیروی یا اس سٹیٹ کی وفاداری قبول کرتے ہیں یا نہیں جس میں وہ پیدا ہوئے ہیں۔ اس طرح تو کوئی اجتماعی نظام کبھی دنیا میں چل نہیں سکتا۔[1]"

مَیں اِس سوال کا فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیتا ہوں کہ مولانا کی اس مخصوص طرزِ استدلال سے عقل انسانی مطمئن ہو سکتی ہے یا نہیں۔ مَیں ذاتی طور پر اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ جب بھی وہ کسی باریک مسئلہ کی فضاء میں قدم رکھتے ہیں اُن کی نظر قابلِ رحم حد تک دُھندلا جاتی ہے اور مختلف شکلوں اور تصاویر میں فرق نہیں کر سکتے۔ ان کے اسلامی نظریہ ریاست

---

[1] "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں" صفحہ ۴۶ - ۴۷ ؎

پر جو دھند طاری ہے اور جس کی بناء پر اُنہوں نے فاش نوعیت کی بنیادی غلطیاں کی ہیں اس وقت اُن کے ذکر کا یہاں موقعہ نہیں ورنہ ایک کتاب اندر کتاب بن جائے۔ البتہ اس استدلال کے متعلق جو ابھی قارئین کی نظر سے گذرا ہے میں مولانا کی توجہ ایک چھوٹی سی فروگذاشت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جس کی درستی اُن کے نظریۂ استبداد میں مزید وسعتیں پیدا کرنے کا موجب ہوگی۔

اس دلیل کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ "ہر دین اپنے پیرووں کی اولاد کو فطرۃً اپنا پیرو قرار دیتا ہے"۔ اس لئے مسلمان کہلانیوالوں کی اولاد خواہ اُس اولاد کے ماں باپ مودودی صاحب کی نظر میں عملاً کافر ہی ہوں بہرحال اسلام کی جائداد کہلائے گی۔ پس جب اسلام کی ملکیت اُن پر ثابت ہوگئی تو سنِ بلوغت کے بعد اُنہیں کس طرح اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ جو چاہیں بن جائیں۔ یہ نظریہ قائم فرماتے وقت غالباً مولانا کی نظر سے وہ ارشادِ نبوی اوجھل رہ گیا تھا کہ:-

مَا مِنْ مَّوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ فَاَبَوَاہُ
یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ

(البخاری)

"ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ اُس کے ماں باپ

کا دخل ہوتا ہے جو اُسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں"

اگر مولانا کا مذکورہ بالا اقتباس درست ہے تو پھر اس کے نتیجہ کو مسلمان کہلانے والوں کی اولاد تک ہی کیوں محدود رکھا جائے۔ ساری دنیا کے بچے اسلام کی وراثت ہیں۔ اُن کو کیوں اِس سعادت سے محروم رہنے دیں اور کیوں اُن کے ماں باپ کو یہ اختیار دے دیں کہ سنّ بلوغ تک پہنچنے سے پہلے پہلے اُنہیں" ابتداءً کفار یا اغیار کی حیثیت سے پرورش" کریں تعجب ہے کہ یہ حدیث اُن کی نظر سے کس طرح رہ گئی۔ یہ دلیل تو نعوذ باللہ تشدد پسندوں کی بنیادی دلیل ہونی چاہیئے تھی کیونکہ اس کی پہنچ صرف مسلمانوں تک محدود نہیں بلکہ کفار تک بھی ممتد ہے اور دنیا کے کونے کونے میں ہر مذہب وملت ہر کالے گورے پر اس کا وار یکساں پڑتا ہے۔ اگر نعوذ باللہ اس کے وہی معنے لیئے جائیں جو مودودی طرزِ استدلال سے نکلتے ہیں تو پھر تو ایک بھی کافر بچہ ہاتھ سے نکل کر نہیں جا سکتا۔

بہرحال میرا کام صرف توجہ دلانا تھا۔ آگے مولانا کو اختیار ہے۔ میں تو نہ اُنہیں زبردستی کسی بات کا قائل کر سکتا ہوں نہ اِس بات کا خود قائل ہوں کہ اعتقادات اور خیالات کے بارہ میں کوئی زبردستی کی جا سکتی ہے۔

میرے نزدیک تو یہ ناممکن ہے کہ کوئی سچا مذہب صداقت کی تعلیم دیتے ہوئے کسی کو جھوٹ بولنے پر مجبور کرے۔ کیا کبھی سچ کے بیج سے جھوٹ کی

کونپلیں پھوٹ سکتی ہیں یا جھوٹ کی گٹھلی سے صداقت کا درخت اُگا ہے؟ کیا کبھی گندم کے دانوں سے کچلے کے پودے نکلتے دیکھے ہیں؟ اگر ایسا ہونا ممکن نہیں تو پھر کیسے ممکن ہے کہ اسلام جو کہ ایک مجسّم صداقت ہے خود بنی نوع انسان کو جھوٹ بولنے پر مجبور کرنے لگے۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ایسا شخص جس کا دل اسلام کی صداقت کا قائل نہ رہا ہو اور خدا کی لاشریک وحدانیت کو تسلیم نہ کرتا ہو اور اپنی حماقت سے اِس عقیدہ پر تسلّی پا گیا ہو کہ مسیح خدا کا بیٹا تھا اور اس کی خدائی میں شریک تھا۔ تو ایسے شخص کے سامنے اسلام تلوار لے کر کھڑا ہو جائے کہ پہلے کہا کیوں تھا کہ خدا ایک ہے۔ اب تو خواہ تم مانو نہ مانو تمہیں یہی کہنا پڑے گا کہ وہ ایک ہے ایک ہے۔ اگر وہ یہ سوال کر بیٹھے کہ حضور جب میرا دل یہ گواہی دیتا ہے کہ وہ ایک نہیں تو میں کس طرح یہ گواہی دیدوں کہ وہ ایک ہے تو یہ جواب سُن کر یہ کہتی ہوئی اسلام کی تلوار گرے گی اور اس کا سر قلم کرے گی کہ راستی پسند کہیں کا، جھوٹ نہیں بولتا۔

اگرچہ یہ درست ہے کہ خدا ایک ہے اور اس میں بھی قطعاً کوئی شک نہیں کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں منافقین نے یہی سچی گواہی دی تو محض اس لئے کہ اُن کے دل یہ گواہی نہیں دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

قرآنِ کریم میں سورۃ منافقون کی پہلی آیت میں اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے:۔

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ

جب تیرے پاس منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تُو خدا کا رسول ہے مگر باوجود اِس کے کہ اللہ (تعالیٰ) جانتا ہے کہ تُو اُس کا رسول ہے اللہ یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق یقیناً جھوٹ بولتے ہیں۔

پس خدا تعالیٰ تو چاہتا ہے کہ منافق یہ جھوٹ بولنا چھوڑ دیں مگر مولانا مودودی اِس عقیدہ کے قائل ہیں کہ صداقت کے نام پر بزورِ شمشیر لوگوں کو جھوٹ بولنے کی تلقین کی جائے۔ مَیں چونکہ اِس نظریہ کا قائل نہیں اس لئے مولانا کو مجبور نہیں کرسکتا کہ میری بات مان لیں۔ میرا مذہب تو سیدھا سادہ یہی ہے کہ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ٥ تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین۔

ضمناً مَیں یہاں اس شُبہ کا بھی ذکر کر دوں کہ ہوسکتا ہے مولانا یہ فرمائیں کہ اس آیت میں جن منافقین کا ذکر ہے وہ تو سرے سے ایمان

ہی نہیں لائے تھے اور مولانا جن لوگوں کو جھوٹ بولنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں وہ قسم صرف اُن منافقین کی ہے جو ایک دفعہ یہ جان بوجھ کر کہ یہ راستہ آمد و رفت کے لئے کُھلا ہوا نہیں پھر بھی اسلام لے آئے تو میں مولانا سے درخواست کروں گا کہ مندرجہ بالا آیتِ قرآنی سے ملی ہوئی اگلی دو آیات پر بھی نظر ڈال لیں تو سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے :-

اِتَّخَذُوٓا اَیۡمَانَہُمۡ جُنَّۃً فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اِنَّہُمۡ سَآءَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۝ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ اٰمَنُوۡا ثُمَّ کَفَرُوۡا فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ فَہُمۡ لَا یَفۡقَہُوۡنَ ۝ (المنافقون عٓ)

"انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور (اس ذریعہ سے لوگوں کو) راہِ خدا سے روک رہے ہیں۔ یقیناً بہت ہی بُرا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ یہ اِس وجہ سے ہے کہ (پہلے تو) وہ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے۔ اِس کے نتیجہ میں اُنکے دلوں پہ مُہر لگا دی گئی۔ پس وہ سمجھتے نہیں :"

اِن ہر دو آیات کے مضمون سے یہ یقینی طور پہ ثابت ہو جاتا ہے کہ :-

اوّل :- یہ منافقین جن کا ذکر کیا گیا ہے مُرتد تھے۔ پہلے ایمان لائے

اور پھر کافر ہو گئے۔

دوم :- ان کا یہ فعل کہ باوجود اس امر کے کہ یہ اسلام سے پھر گئے تھے پھر بھی گواہی دیتے تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں، خدا تعالیٰ نے سخت ناپسند فرمایا۔ ان کو "جھوٹا" کہا اور فرمایا کہ "بہت ہی بُرا ہے جو وہ کرتے ہیں۔"

سوم :- خدا تعالیٰ نے ان کی اس منافقانہ گواہی کو اسلام کے لئے مفید نہیں بلکہ سخت نقصان دہ قرار دیا اور فرمایا کہ اس طریق سے یہ لوگوں کو راہِ خدا سے روک رہے ہیں۔

لیکن مودودی صاحب کا عقیدہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ خدا تعالیٰ تو فرماتا ہے جھوٹے ہیں۔ بہت بُرا کرتے ہیں۔ مودودی صاحب کا اصرار ہے کہ ایسا ہی کرو۔ دل سے بے شک نہ مانو مگر مُنہ سے یہی گواہی دیتے رہو کہ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خدا تعالیٰ کے رسول ہیں ورنہ گردن مار دیئے جاؤ گے۔ چنانچہ راستی پسندی کا طعنہ دیتے ہوئے ایسے مرتد کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں :-

"اگر وہ ایسا ہی راستی پسند ہے کہ منافق بن کر رہنا نہیں چاہتا بلکہ جس چیز پر اب ایمان لایا ہے اُس کی پیروی میں صادق ہونا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو سزائے موت

کے لئے کیوں پیش نہیں کرتا؟"[1]

یہ راستی پسندی کا طعنہ دے کر منافقت کی تلقین کرنا بھی مولانا کا شاہکار ہے۔

پس خدا تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ جھوٹو منافق نہ بنو اور مولانا کا ارشاد ہے راست باز آئے کہیں کے "منافق بن کر جان کیوں نہیں بچاتے؟ اور خدا تو فرماتا ہے کہ اِس قسم کی منافقت لوگوں کو راہِ خدا سے روکتی ہے (اور اسلام کے لئے سخت نقصان دہ ہے) مگر مولانا کا اصرار ہے کہ اگر ایسے مرتدین کو سچ بولنے کی اجازت دے دی جائے تو اسلام قائم ہی نہیں رہ سکتا "اِس طرح تو کوئی اجتماعی نظام کبھی دنیا میں چل نہیں سکتا۔"

کیا اِس اختلاف کے بارہ میں کسی رائے زنی کی ضرورت رہتی ہے؟

مَیں نے اِس باب کے شروع میں یہ بحث اُٹھائی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز "قتلِ مرتد" کے غیر فطری اور غیر منصفانہ نظریہ کے قائل نہ تھے اور اِس امر کا اظہار کیا تھا کہ قرآن کریم اِس بارہ میں آپ کے اُسوہ پر غیر مشکوک روشنی ڈالتا ہے۔ پس آیئے اب ہم اِس مسئلہ پر قرآن کریم سے فیصلہ طلب کریں کیونکہ قرآنی فیصلہ سے بہتر اور یقینی اور کوئی فیصلہ نہیں۔

---

[1] "مرتد کی سزا" صفحہ ۵۲ +

سورۃ "المنافقون" (جس کی چند آیات اُوپر نقل کی گئی ہیں) ہی دراصل وہ سورۃ ہے جس کی طرف مَیں نے اشارہ کیا تھا۔ یہ سورۃ قتلِ مرتد کے مسئلہ کو بحیثیت مسئلہ ہی واضح نہیں کرتی بلکہ اِس بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اُسوہ کو بھی پیش کرتی ہے اور مسئلہ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے ہر شک کو رفع کرتی ہے۔ اِس سورۃ میں یقینی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایسے مرتدین کی خبر دی گئی تھی جو منافق بن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچّا ہونے کی گواہی دیتے تھے مگر خدا نے اُن کے سارے پول کھول دیئے۔ مگر باوجود اس کے ان کے قتل کے بارہ میں نہ تو خدا تعالےٰ کی طرف سے کوئی حکم نازل ہوُا نہ ہی آنحضرتؐ نے خود اُن کو اِس جُرم میں قتل کروایا۔ ممکن ہے مولانا یہ شُبہ پیدا کریں کہ اللہ تعالیٰ یہ فرما کر کہ "منافقین جھوٹے ہیں" دوسری آیت کو اِس طرح شروع فرماتا ہے۔ اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَھُمْ جُنَّۃً ...... اُنہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے۔ یہ ڈھال دراصل اِرتداد کی سزا یعنی قتل سے بچنے کے لئے تھی اور وہ مُسلمانوں کو دھوکہ اس لئے دے رہے تھے کہ کہیں ہمارے اِرتداد کا علم ہوگیا تو ہمیں قتل ہی نہ کر دیں۔

بظاہر تو یہ ایک راہِ فرار نکل آتی ہے مگر مولانا ذرا کچھ آگے چل کر تو دیکھیں۔ اِس سورۃ نے ایسی ناکہ بندی کر رکھی ہے کہ واہمہ تک کو گزرنے کی مجال نہیں۔ چنانچہ اِنہی مرتدین کا ذکر جاری رکھتے ہوئے کچھ آگے چل کر اللہ تعالےٰ فرماتا

ہے :۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ٥

"اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ رسولِ خدا تمہارے لئے (خدا سے) بخشش مانگیں گے تو سر مٹکانے لگتے ہیں اور تکبر کرتے ہوئے مُنہ پھیر لیتے ہیں۔"

اِس آیت کے ہوتے ہوئے اِتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً سے یہ مراد لینی کہ وہ قسمیں اِس خوف سے کھاتے تھے کہ قتل نہ کر دیئے جائیں ایسی صریح زیادتی ہے کہ اِس سے بڑھ کر اور کیا زیادتی ہوگی۔ اِس آیت سے جو واضح غیر مبہم نتائج نکلتے ہیں وہ یہ ہیں کہ :۔

(۱) اُن مرتدین کے لئے کسی قسم کے خوف کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا بلکہ جب اُنہیں کہا جاتا تھا کہ آؤ توبہ کر لو تو سر مٹکاتے تھے، مُنہ پھیر لیتے تھے اور سخت تکبر سے پیش آتے تھے۔ کیا موت سے ڈرا ہوا انسان یہ مظاہرہ کیا کرتا ہے؟ اگر اُنہوں نے کسی خوف کی وجہ سے یہ جھوٹ بولا ہوتا تو پھر تو یہاں یہ ہونا چاہیئے تھا کہ یہ سُن کر ڈر کے مارے اُن کے ہواس خطا ہونے لگتے ہیں اور پھر وہ بڑے زور سے قسمیں کھاتے ہیں کہ استغفر اللہ واللہ باللہ تاللہ

ہم تو مومن ہیں اور اگر تم نہیں مانتے تو ہم اب توبہ کر لیتے ہیں۔

(۲) یہ لوگ کوئی غیر معروف لوگ نہیں تھے بلکہ مسلمان جانتے تھے کہ یہ مرتدین کون ہیں بھی تو جا کر اُن کو نصیحت کرتے تھے کہ توبہ کر لو۔ اور اگر بفرضِ محال پہلے نامعلوم بھی تھے تو اب اس سورۃ کے نزول کے بعد بہر حال معلوم ہو چکے تھے۔

(۳) خدا تعالیٰ نے اِس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ آؤ توبہ کرو ورنہ قتل کر دیئے جاؤ گے بلکہ یہ فرمایا کہ آؤ (میرا) رسول تمہارے لئے بخشش مانگے گا اگر ارتداد کی سزا قتل تھی تو کیا یہ آیت اِسی طرح ہونی چاہیئے تھی؟

مگر اب تو ارتداد پر طرّہ یہ کہ اُن مرتدّین کی طرف سے سخت گستاخی بھی سرزد ہونے لگی۔ مسلمانوں کی کھُلی کھُلی تحقیر کرنے لگے۔ سر مٹکانے لگے منہ پھیرنے لگے۔ تکبّر کرنے لگے۔ یہاں پہنچ کر ایک متشدّد ضرور یہ توقّع رکھ سکتا ہے کہ اب اگلی آیت میں اُن کے قتل کا حکم آ جائے گا بلکہ شاید عذاب دیکر مارے جانے کی تلقین ہو۔ مگر افسوس کہ ان کے لئے ایک اور مایوسی کا منہ دیکھنا باقی ہے۔ کیونکہ نہ تو اگلی آیت میں۔ نہ اُس سے اگلی آیت میں۔ نہ اُس سے اگلی آیت میں حتّٰی کہ بقیہ ساری سُورۃ ہی میں کہیں اُن کے قتل کا حکم نہیں ملتا۔

قتل کا حکم تو ایک طرف رہا ابھی تو اُنہیں اور ڈھیل دی جا رہی ہے

اور آگے چل کر اللہ تعالیٰ اُن کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ مرتد صرف مسلمانوں کی ہی تحقیر نہیں کرتے بلکہ ظالم سیّدِ وُلدِ آدم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی بھی سخت تحقیر کر رہے ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے:۔

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

"کہتے ہیں جوں ہی ہم مدینہ واپس پہنچے معزز ترین شخص (یعنی بدبخت منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول) (نعوذ باللہ) ذلیل ترین انسان کو مدینہ سے نکال دے گا۔ حالانکہ عزّت خدا ہی کی ہے۔ اور اُس کے رسول کی اور مومنوں کی۔ مگر منافقین نہیں جانتے۔"

اِس آیت میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک غزوہ کے موقع پر جس میں بعض مرتد منافقین بھی مسلمانوں کیساتھ لشکرکشی میں شریک تھے۔ عبداللہ بن ابی بن سلول نے اپنی محفل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے متعلق مندرجہ بالا ناپاک الفاظ استعمال کئے اُس بدبخت کا مطلب یہ تھا کہ مدینہ واپس جا کر وہ نعوذ باللہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم اور آپ کے ساتھیوں کو مدینہ سے نکال دے گا

یہ بات جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم تک پہنچی اور آپؐ نے تحقیق فرمائی تو یہ لوگ جھوٹ بول گئے اور کہا کہ آنحضرتؐ نے ایک نوعمر لڑکے کی گواہی پر اعتبار کر لیا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ نے اپنی وحی کے ذریعہ سورۃ المنافقون میں یہ معاملہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم پر واضح فرما دیا اور اُس گواہی کی تصدیق فرمائی۔

یہ ایک ایسا جُرم تھا کہ جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے ہر محبّت رکھنے والے کو شدید غیرت آجاتی ہے اور دل کھولنے لگتا ہے اور طبعاً انسان یہ سوچتا ہے کہ کم از کم اس بدبخت کو تو ضرور کوئی سزا دی جائے گی کیونکہ اس کا جُرم صرف جُرم ارتداد ہی نہیں رہا بلکہ یہ ذلیل ترین مرتدّ دُنیا کے معزّز ترین رسولؐ کے خلاف انتہائی گُستاخی کا مرتکب ہوا ہے اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ یہ کلمات اُس نے ایک فوج کشی کے دَوران میں کہے جو قوموں کی زندگی پر ایک ہنگامی دَور ہوا کرتا ہے اور ایسے وقت میں سپہ سالار کے خلاف ایسے الفاظ صریح غدّاری کے مترادف سمجھے جاتے ہیں جس کی سزا موت ہے۔ خصوصاً ایک مخصوص پارٹی میں بیٹھ کر ایسی بات کرنا تو اور بھی زیادہ بھیانک جُرم بن جاتا ہے اور ایک سازش کا پتہ دیتا ہے۔ مگر کیا اِس موقعہ پر ایک رنج اور غُصّہ سے بھرے ہوئے دل کو یہ پڑھ کر سخت حیرت نہیں ہوتی کہ کوئی ایسی سزا نہ

خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمائی گئی نہ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے خود تجویز فرمائی۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی جناب مودودی صاحب یہ تأویل بھی نہیں کر سکتے کہ اُس وقت کمزوری کا دور تھا اور اس شخص کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ کیونکہ یہ دور تو خود مولانا کے الفاظ میں وہ دور تھا:۔

"جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعیٔ اسلام نے تلوار ہاتھ میں لی ۔۔۔۔ تو رفتہ رفتہ بدی و شرارت کا زنگ چھوٹنے لگا۔ طبیعتوں سے فاسد مادے خود بخود نکل گئے"۔

چنانچہ یہ اُسی "تلوار" کے دور کی بات ہے جبکہ "بدی و شرارت کا زنگ چھوٹ" رہا تھا اور "طبیعتوں سے فاسد مادے نکل" رہے تھے۔

اگر قطع نظر مولانا کی اس رائے کے تاریخی شواہد بتا رہے ہیں کہ اِس بات کے وہم تک کی گنجائش نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے نعوذ باللہ اُس کے خوف کی وجہ سے اُسے معاف فرما دیا۔ اوّل تو ایسے خیال کو دل میں جگہ دینا ہی اُس مقدّس رسولؐ کی سخت گستاخی ہے۔ دوسرے اُس بدبخت کی طاقت کی قلعی تو اسی امر سے کھل جاتی ہے کہ اُس کا اپنا بیٹا اپنے باپ کو چھوڑ کر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے قدموں کی خاک کا غلام بنا ہوا تھا۔ اور اُس کی فدائیت کا یہ عالم تھا کہ جب اُس نے اپنے باپ کے متعلق یہ شرمناک بات سُنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی

محبت نے اُس کے دل میں ایک عجیب ہیجان پیدا کر دیا اور محبوب کی ہتک ہوتے دیکھ کر غیرت ایسی بھڑکی کہ خود آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ اگر آپؐ نے میرے بدبخت باپ کے قتل ہی کا فیصلہ فرمایا ہے تو مجھے حکم دیجئے کہ مَیں خود اُسے اپنے ہاتھ سے قتل کروں لیکن اس بیٹے کی پیشکش کو بھی اس رحم مجسّم نے ٹھکرا دیا اور کیسی رحمت بے پایاں تھی کہ دنیا کے معزّز ترین انسان نے ایک ننگِ انسانیت ذلیل ترین مرتدّ کو بھی معاف فرما دیا اور پھر اس کے بعد بھی ایک عجیب واقعہ ہوا کہ جس کی نظیر تاریخِ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ جس معصوم کے خلاف وہ جرم کیا گیا تھا۔ اُس نے تو معاف فرما دیا مگر مجرم کا بیٹا اُسے معاف نہ کر سکا۔ اور جب مدینہ کی حدود میں وہ قافلہ داخل ہو رہا تھا اور قریب تھا کہ عبداللہ بن اُبیّ بھی داخل ہو تو یہ بیٹا جس کا سینہ ابھی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ہتک کے خیال سے غصّہ سے کھول رہا تھا آگے بڑھا اور اپنے باپ کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی تلوار نیام سے نکال لی اور کہا کہ خدا کی قسم مَیں آج تیرا سر قلم کر دوں گا اور مدینہ کی گلیوں میں گھُسنے نہ دوں گا جب تک تو یہاں اعلان نہ کرے کہ مَیں دنیا کا ذلیل ترین انسان ہوں اور محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم معزّز ترین انسان ہیں۔

اپنے بیٹے کے چہرہ پر ایک نظر ڈالتے ہی وہ سمجھ گیا کہ یہ جو کچھ کہتا ہے سچ کر دکھائے گا۔ پس اُس کی نظریں جُھک گئیں اور اپنے کیئے پر معذرت پیش کرنے لگا۔ اس پر بھی شاید اُسے نجات نہ ملتی مگر جانتے ہیں کہ اسکی نجات کو کون آیا؟ —— وہی سب محبوبوں کا محبوب رسول، اور وہی سب درگذر کرنیوالے انسانوں سے زیادہ درگذر کرنیوالا۔ وہ جو ابراہیمؑ کی دعاؤں کا ثمرہ تھا اور جس کے ظہور کی موسیٰؑ نے بھی خبر دی تھی۔ ہاں وہی دلوں کو بے اختیار موہ لینے والا جس کی محبت کے داؤدؑ گیت گاتا رہا۔ وہی رحمتہ مجسم اُس مجرم باپ کو اُس کے بیٹے کے ہاتھوں سے بچانے کے لئے آگے آیا۔ آپؐ کی اونٹنی جب قریب پہنچی اور آپؐ نے یہ ماجرا دیکھا تو فوراً اونٹنی کو آگے بڑھا کر اُس بیٹے کو منع فرمایا اور راستہ چھوڑنے کی تلقین فرمائی۔

یہ تھا آپؐ کا سلوک ایک ایسے مرتد کے ساتھ جو سب مرتدین کا سردار تھا۔ جس کے ارتداد کی خود خدا نے گواہی دی اور جو اپنی زبان سے اپنی انتہائی ذلّت پر ہمیشہ کے لئے مُہر لگا گیا۔ —— لیکن جرمِ ارتداد کی سزا قتل قرار دینے والوں کو میں بتاتا ہوں کہ میرے محبوب آقاؐ کا کرم یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے اور بھی اعلیٰ اور ارفع مقام آتے ہیں۔

یہ وقت گذر گیا اور نہ اُس وقت نہ اُس کے بعد کسی نے اُس مرتدوں کے سردار یا اُس کے ساتھیوں کے خلاف تلوار اُٹھائی۔ یہاں تک کہ اُسنے طبعی موت اپنے بستر پر جان دی پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ہمیشہ ہمیش کے لئے اپنے سلوک سے یہ ثابت فرما دیا کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل نہیں اور یہ گواہی قرآنِ کریم میں ابدالاباد تک لکھی گئی۔ آپؐ کا یہ سلوک ایسے مرتدّین کے ساتھ تھا جن کے ارتداد کے بارہ میں کوئی شائبہ بھی باقی نہیں رہا تھا کیونکہ یہ ارتداد کا فتویٰ کسی انسان نے نہیں لگایا تھا بلکہ خود اُس عالم الغیب خدا نے لگایا تھا جو دلوں کے ہر راز سے واقف ہے اور سب گواہوں سے زیادہ سچّا گواہ ہے۔ صرف یہی نہیں کہ آپؐنے اس دنیا میں اُسے ارتداد کی کوئی سزا نہیں دی بلکہ رحمت کی حد یہ ہے کہ اس کی موت پر آپ کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ کہیں وہ آخرت کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائے۔ حیرت ہے کہ آپؐ کا دل اُسی کینہ ور کے لئے بے چین ہو گیا جو ہمیشہ آپؐ سے دشمنی کرتا رہا۔ جس کا سینہ آپؐ کی ترقّی کو دیکھ کر بُغض اور عناد سے بھر جاتا تھا اور جس کا دل آپؐ کے حسد میں ہمیشہ جلتا رہا۔ آپؐ اُس کی موت پر اس ارادہ سے اُس کے جنازہ کے لئے نکلے کہ اپنے خدا کے حضور گریہ وزاری کر کے اور اُس کے غیر محدود رحم اور عفو کا واسطہ دیکر اپنے اِس بدبخت دشمن کے لئے بخشش کے طالب ہوں گے۔ آپؐکے

اس مقدس ارادہ کا اس طرح پتہ چلتا ہے کہ جب آپؐ جنازہ کے لئے نکلے تو حضرت عمرؓ نے جنازہ نہ پڑھنے کا مشورہ عرض کیا لیکن جب آپؐ کو مُصر پایا تو وہ آیتِ قرآنی پیش کی جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (سورۃ توبہ) کہ اگر تُو اُن کے لئے یعنی منافقوں کے لئے ستّر مرتبہ بھی معافی مانگے تو اللہ تعالیٰ اُنہیں معاف نہیں کرے گا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو جواب دیا وہ ایسا پیارا ہے کہ جان آپؐ پر نچھاور ہونے لگتی ہے اور روح قدم بوسی کرتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ عُمر! خدا تعالیٰ نے ستّر مرتبہ فرمایا ہے۔ مَیں ستّر سے زیادہ مرتبہ بخشش مانگ لُوں گا۔

پس اے میرے آقا پر جبر و تشدّد کا الزام لگانے والو! آؤ۔ تم کہاں ہو۔ آؤ کہ مَیں تمہیں اس لاثانی دل کے ساتھ متعارف کرواؤں جس کا رحم ابراہیمؑ کے رحم سے بڑھ کر تھا اور جس کی بخشش کے سامنے مسیحؑ کی بخشش ایک واہمہ کی حیثیت تھی۔ وہ جو زمین کے ذلیل ترین کیڑوں کے ہاتھوں بھی ستایا گیا اور جس نے ظالم ترین سفّاکوں کو بھی معاف کر دیا۔ آؤ اور اس کریم فطرت کا نظّارہ کرو اور اُس حلیم دل کو دیکھو کہ جس کا صبر صبرِ ایّوبؑ کو شرماتا تھا۔ ہاں وہی حُسنِ کامل کا مظہرِ تام جو اپنے ہر خُلق میں ہر دوسرے نبی سے افضل تھا۔ اُس کے نُور سے دمکتے ہوئے چہرہ کی طرف نگاہ کرو اور

بتاؤ کہ کیا یہ وہی ہے جس کی تصویر تم نے اپنے تاریک قلموں سے کھینچ رکھی ہے؟
کیا یہ وہی ہے جس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں قرآن ہے؟

کاش تمہاری نگاہیں شرم سے جُھک جائیں اور ندامت سے تمہاری آنکھیں خونِ نابہ ٹپکانے لگیں۔

مگر تمہارے دل پارہ نہیں ہوتے !!!

تشدد کے کچھ اور شاخسانے

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی جو تصویر مولانا مودودی نے کھینچ رکھی ہے اُسے دیکھ کر ایک تھوڑی سی سمجھ رکھنے والا انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ تصویر ہر غیر مسلم کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ مودودی صاحب کے اسلام کا تصور سوداؔ کے اس جملہ میں سمٹ آتا ہے کہ:۔

لانا بے غنچے میرا قلمدان

سوداؔ ایک ہجو گو شاعر تھے اور جب کسی مخالف کو اپنی مرضی منوانا مقصود ہوتی تو سننے میں آیا ہے کہ دھمکی کے طور پر یہ فقرہ کہا کرتے تھے۔ مولانا کے اسلامی تصور کا ٹیپ کا مصرعہ بھی کچھ اسی قسم کا بنتا ہے

کر :-

لاتا ہے غنچے میری تلوار

پس ابھی ان کی تلوار کی دھمکی ختم نہیں ہوئی اور ابھی تشدد کے کچھ اور شاخسانے باقی ہیں :-

ہر چند سُبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

جب تشدد کا چکر ایک مرتبہ چل پڑا تو تشدد کے سوا اُسے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ اب "سنگِ گراں" راہ میں یہ آیا ہے کہ اِس بھیانک تصور کو پیش کرنے کے بعد تبلیغ کے تو سارے دروازے بند ہو گئے۔ "چوہے دان" میں تو "چوہا" اُس وقت پھنسا کرتا ہے جب اُسے متنبّہ نہ کیا گیا ہو، مگر یہاں تو وہ متنبّہ کر دیا گیا ہے۔ اور پیدائشی مسلمانوں کا حال بھی وہ دیکھ چکا عبادات کی قواعد بھی اُس کی نظر سے اوجھل نہیں رہی۔ مذہب کے نام پر خونریزی ہوتی بھی اُس نے دیکھ لی اور بغاوت کی عام تعلیم سے بھی واقف ہو گیا۔ پھر وہ کیا ایسا ہی سر پھرا "چوہا" ہے کہ خود "چوہے دان" کے اندر آ جائے گا ؎

ایں خیال است و محال است و جنون

این بیشہ مپندار کہ خالی است
باشد کہ پلنگ خفتہ باشد

ہمسایہ کا حق

مگر یہ سنگِ گراں بظاہر کیسا ہی کوہِ گراں کیوں نہ نظر آئے مودودی صاحب کی پُر تشدد پالیسی کے سامنے یہ سب رکاوٹیں ہیچ ہیں اور خاکِ راہ کی طرح اُڑ جاتی ہیں۔ چنانچہ غیروں کے لئے آپ ایک تین نکاتی پروگرام تجویز فرماتے ہیں۔ اس کا پہلا جزء حقوقِ ہمسائیگی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور دوسرے لفظوں میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ چوہا اگر ہمارے پاس نہیں آ سکتا تو ہم تو چوہے کے پاس جا سکتے ہیں۔

آپ ہمسایہ کافر ملکوں پر حملہ کرنے کی ایک وجہِ جواز پیش فرماتے ہیں جو آپ ہی کے الفاظ میں سُننے کے لائق ہے:۔

"اسلام یہ انقلاب ایک ایک ملک یا چند ملکوں میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں برپا کرنا چاہتا ہے۔ اگرچہ ابتداءً مسلم پارٹی کا فرض یہی ہے کہ جہاں جہاں وہ رہتے ہوں وہاں کے نظامِ حکومت میں انقلاب پیدا کریں۔ لیکن اُن کی آخری منزلِ مقصود ایک عالمگیر انقلاب کے سوا کچھ نہیں۔"[1]

یہاں مجھے بھی مولانا سے اتفاق ہے کہ اسلام کی آخری منزلِ مقصود ایک عالمگیر انقلاب کے سوا کچھ نہیں مگر اختلاف یہ ہے کہ انقلاب سے مولانا

---

[1] "حقیقتِ جہاد" ص ۶۳۔

کی مراد بعینہٖ وہی ہے جو اشتراکی انقلاب سے ہے۔ حتیٰ کہ نعرہ بھی وہی ہے۔ مگر میرے نزدیک اسلام کی آخری منزلِ مقصود ایک رُوحانی عالمگیر انقلاب رونما کرنا ہے۔

مولانا کا اسلامی انقلاب قدم بقدم اشتراکیت کی ڈگر پر چل رہا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے بھی ایک جگہ گذارش کی تھی اگر آپ مسلم پارٹی کی بجائے کمیونسٹ پارٹی پڑھنا شروع کر دیں تو مجال ہے کہ کوئی اشتراکی سمجھ سکے کہ لینن کی آواز ہے کہ مودودی صاحب کی۔ اشتراکی انقلاب کی بنیاد بھی **ذات** پر مبنی نہیں **عدل** پر ہے۔ اور مودودی صاحب کا انقلاب بھی اِسی مرکزی تصوّر کے گرد بلکہ اسی کے بہانے گھومتا ہے۔ اور حد یہ ہے کہ وجہِ جواز بھی دونوں کی ایک ہی سی ہے اور ہمسایہ کے حقوق کا تصوّر بھی بعینہٖ ایک ہے۔ دیکھئے مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

"انسانی تعلقات و روابط کچھ ایسی ہمہ گیری اپنے اندر رکھتے ہیں کہ کوئی ایک مملکت بھی اپنے اصول و مسلک کے مطابق پُوری طرح عمل نہیں کر سکتی جب تک کہ ہمسایہ ملک میں بھی وہی اصول و مسلک رائج نہ ہو۔ لہٰذا مسلم پارٹی کے لئے اصلاحِ عمومی اور تحفّظِ خودی دونوں کی خاطر یہ ناگزیر ہے کہ کسی ایک خطّہ میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنے پر اکتفاء

نہ کرے۔[۵۱]"

آپ نے یہ ہمسایہ ملکوں کے حقوق کے بارہ میں مودودی صاحب کا "اسلامی تصور" ملاحظہ فرما لیا۔ کیا اس میں اور اشتراکی تصور میں کوئی فرق ہے؟

اب آگے چلئے کہ یہ مقصد حاصل کس طریق پر ہوگا تو وہ طریق یہ نظر آتا ہے کہ ایک طرف تو یہ مسلم پارٹی تمام ممالک کے باشندوں کو یہ دعوت دے گی کہ "اس مسلک کو قبول کریں جس میں اُن کے لئے حقیقی فلاح مضمر ہے۔ **دوسری طرف اگر اس میں طاقت ہوگی تو وہ لڑ کر غیر اسلامی حکومتوں کو مٹا دیگی۔**"

تشدّد اور گھٹیا بزدلی کا جو امتزاج اِس آخری فقرہ میں پایا جاتا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ "اگر اس میں طاقت ہوگی تو وہ لڑ کر......" یا دوسرے لفظوں میں جہاں کوئی کمزور دیکھا اُسے مار کوٹ کر منوا لے گی اور جہاں طاقتور نظر آیا وہ دعوت نامہ نکال کر پیش کر دے گی۔ کمزور مظلوم کے متعلق جس پر حملہ کیا جا رہا ہو تو اس پالیسی کا تصور قابلِ برداشت ہے کیونکہ اُس کے اختیار ہی میں نہیں ہے کہ وہ اس حملہ کو روک سکے۔ وہ اگر اپنے آپکو کمزور پاکر اس ڈر سے کہ مجھے لڑائی میں اور بھی زیادہ مار نہ پڑ جائے چُپ سادھ جائے تو انسان اُسے معذوری کا نام دے سکتا ہے۔ مگر ایک

---

۵۱ "حقیقتِ جہاد" صہ ۶۲ ؎

حملہ آور کی یہ پالیسی کہ ایک جیب میں چُھرا ہو اور دوسرے میں دعوتی کارڈ، اس کے لئے جو نام میرے ذہن میں آتا ہے وہ اگر میں نے لکھ دیا تو مولانا ضرور ناراض ہوں گے اور سخت ناراض ہوں گے۔ مگر وہ بھی بے چارے مجبور ہیں۔ اگر عقائد بگاڑ دیئے گئے ہوں اور دلائل اور اخلاقِ حسنہ اور قربانی اور دُعا اور نصیحت اور صبر کے تمام ہتھیاروں کے ٹکڑے اُڑ چکے ہوں تو اسلام تو بہرحال کسی طرح پھیلانا ہی ہے نا۔!

اللہ تعالیٰ نے بھی مختلف قسم کے جانور پیدا فرمائے ہیں۔ بعض پرندے ہوتے ہیں جن کے پاس صرف پیار کے گیت ہوتے ہیں اور معصوم حُسن کی بے آواز دعوتیں۔ اور بعض درندے ہوتے ہیں جن کے پاس وحشتناک حملوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ امتزاج شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ہاتھ میں تلوار ہو اور ایک میں دعوتی کارڈ۔

مجھے ایڈورڈ ہفتم کا ایک بُت یاد آگیا۔ یا شاید جارج پنجم کا تھا جو نیلا گنبد میں نصب ہُوا کرتا تھا۔ اُس کے بھی ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے میں قلم۔ یعنی قلم کی حکومت مانو ورنہ تلوار کی سزا پاؤ گے۔ مگر فرق یہ ہے کہ اس کا تعلق محض اُن لوگوں سے تھا جو پہلے ہی سے بزورِ اُس تلوار کے محکوم بنائے جا چکے تھے اور قلم بھی اُن ہی لوگوں کے لئے تھا جن کے لئے تلوار تھی۔ مگر ایسا مجوزہ روز گار بُت ابھی بننے کو ہے جس کے ایک ہاتھ میں ایک

برہنہ چمکتی ہوئی تلوار ہو جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا دعوتی کارڈ بھی لٹکا ہوا ہو اور دوسرے ہاتھ میں محض ایک خوشنما مرقع دعوتی کارڈ ایک چاندی کی طشتری میں سجا ہوا ہو۔ تلوار والا ہاتھ تو ایک نحیف و نزار، نیم مردہ، نیم زندہ مفلوک الحال شخص کی طرف اٹھا ہوا ہو اور طشتری والا ہاتھ دوسری سمت میں ایک دیو ہیکل، تنومند، گرانڈیل جوان کی خدمتِ عالیہ میں وہ چاندی کی طشتری پیش کر رہا ہو۔

لیکن اس طشتری میں ایک چھوٹا سا کارڈ اگر اس مضمون کا بھی لکھ کر رکھ دیا جائے کہ حضور ابھی ہم کمزور ہیں جب طاقتور ہوں گے تو پھر حاضرِ خدمت ہوں گے۔ تو اس بارہ میں کیا خیال ہے؟

لیکن اگر کہیں اندازہ میں غلطی ہو گئی اور انقلابی نظر نے دھوکا کھایا۔ کسی طاقتور پہ تلوار اٹھ گئی تو پھر؟ ——

بہر حال یہ مودودی صاحب کا اشاعتِ اسلام کا تصور ہے اور وہ اس بارہ میں خود مختار ہیں۔ پابند تو ہم لوگ ہیں جنہیں کچھ بولنے کی اجازت نہیں۔ اور اس تصوّر کا خلاصہ سیدھے سادے الفاظ میں یہی ہے کہ چونکہ تم ہمارے ہمسایہ ہو اور ہمارا فرض ہے کہ ہر طرح سے تمہاری بہبود کا انتظام کریں اور بہر حال تمہیں ہلاکت سے بچائیں اس لیے ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ اگر تمہیں اپنے سے کمزور پائیں تو آنکھیں بند کر کے

ہڑپ کر جائیں۔

دوسرے دو نکات

اس تبلیغی پروگرام کے دوسرے دو نکات احتیاطی تدابیر کے طور پر ہیں۔ پہلے کا تعلق غیر مسلموں کے اس حق سے ہے کہ وہ مسلمانوں کو تبلیغ کر سکیں۔ اس کا جواب تو واضح ہی ہے :۔

"اس مسئلہ کا فیصلہ تو بڑی حد تک قتلِ مرتد کے قانون نے خود ہی کر دیا ہے (یعنی نہ رہے بانس نہ بجے بانسری ناقل) کیونکہ جب ہم اپنے حدودِ اقتدار میں کسی ایسے شخص کو جو مسلمان ہو اسلام سے نکل کر کوئی دوسرا مذہب و مسلک قبول کرنے کا حق نہیں دیتے تو لامحالہ اس کے معنی یہی ہیں کہ ہم حدودِ دارالاسلام میں اسلام کے بالمقابل کسی دوسری دعوت کو اُٹھنے اور پھیلنے کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔"[1]

دلیل بڑی واضح ہے اور قارئین سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ مختصراً اپنے الفاظ میں بھی بیان کر دیتا ہوں۔ جب مودودی صاحب کے اسلام نے اپنے لئے مندرجہ ذیل حقوق محفوظ کروا لئے ہوں :۔

(۱) تبلیغی دعوت بھجوانا

---

[1] مرتد کی سزا اسلامی قانون میں صہ ۳۲ ۔

(۲) کوئی قبول کرے نہ کرے جس کسی پر اختیار چلے حملہ کر دینا اور بزور حکومت چھین لینا۔

(۳) اگر اپنوں میں سے کوئی شخص دوسرا مذہب قبول کرے تو اُسے قتل کر دینا۔

تو پھر ظاہر ہے کہ دوسرے مذہب کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ بھی یہی تین طریق اختیار کر لے۔ وہ کوئی سچّا ہے جو اُسے یہ حقوق پہنچتے ہوں۔ مودودی صاحب تو سچّے ہیں۔

کافروں کو کافروں میں تبلیغ کرنیکی ممانعت

آخری نکتہ جو مولوی صاحب اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں پیش فرماتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر بعض کافروں نے کافروں ہی میں تبلیغ شروع کر دی تو ممکن ہے بعض کافر دوسرے کافروں کو قائل کر کے اُن کو ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل دیں اس لئے اُن کافروں کو یہ حق کہاں سے مل گیا کہ کافروں میں تبلیغ کریں۔ یہ الفاظ میرے ہیں دلیل مودودی صاحب کی ہے۔ اب مودودی صاحب کے الفاظ میں بھی اِس دلیل کو سُن لیجئے:۔

"اب ظاہر ہے کہ جب اسلام کا اصل موقف یہ ہے تو اُس کے لئے اس بات کو پسند کرنا تو درکنار گوارا کرنا بھی سخت

مشکل ہے کہ بنی آدم کے اندر وہ دعوتیں پھیلیں جو اُن کو ابدی تباہی کی طرف لے جانے والی ہیں۔ وہ داعیانِ باطل کو اس بات کا کھلا لائسنس نہیں دے سکتا کہ وہ جس آگ کی طرف خود جا رہے ہیں اُس کی طرف دوسروں کو بھی کھینچیں[1]"

مودودی صاحب کے الفاظ بھی آپ نے ملاحظہ فرما لئے۔ اب میں اس پر مزید کیا کہوں ؎

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

یہاں سوال یہ نہیں تھا کہ کافروں کو مسلمانوں میں تبلیغ کی اجازت ہے یا نہیں بلکہ سوال یہ تھا کہ کافروں کو کافروں میں تبلیغ کی اجازت ہے یا نہیں۔ مگر مودودی صاحب کے نزدیک "اسلام" داعیانِ باطلہ کو اس امر کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ دلیل کچھ اس طرح پر قائم کی گئی ہے کہ یہ کس طرح اجازت دی جا سکتی ہے کہ جس کفر کی آگ میں وہ خود پڑے ہوئے ہوں اُس کی طرف دوسروں کو بھی کھینچیں۔ حالانکہ صورتِ حال

---

[1] "مرتد کی سزا" صفحہ ۳۵۔

یہ بنتی ہے کہ جس آگ میں ایک قسم کے کافر پڑے ہوئے ہیں اُسی آگ میں دوسری قسم کے کافر بھی پڑے ہوئے ہیں۔ اور جہاں تک اُن کے آگ میں ہونے کا تعلّق ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس لئے مودودی صاحب کی دلیل دراصل یہ بنے گی کہ 'اسلام' یہ بھی برداشت نہیں کرسکتا کہ ایک وسیع آگ میں جلنے والے کفّار اُس آگ کی دوسری سمت سے لوگوں کو اپنی طرف بلائیں۔ اگر اس بات کی اجازت دیدی جائے تو بے چارے اِس آواز پر لبیک کہنے والے جل جائیں گے۔ اور اسلام یہ ظلم کس طرح برداشت کرسکتا ہے؟

پس بنی نوع انسان کی گہری ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ اوّل تو کچھ پُچکار کر کچھ ڈرا دھمکا کر لوگوں کو اس آگ کے ٹکڑے سے نکالنے کی کوشش کی جائے لیکن اگر کوئی نہ مانے تو کم از کم یہ ضرور کیا جائے کہ لڑ کر بزورِ شمشیر اُس خطۂ نار پر اقتدار حاصل کرلیا جائے اور پھر جب اقتدار حاصل ہوجائے تو تلوار تانے ہوئے سنتری اُن جلتے ہوئے کفّار پر نگران کھڑے ہوجائیں اور ایک آواز دینے والا یہ آواز دے کہ —— "خبردار! تم میں سے کوئی دوسرے کو اپنی طرف نہ بلائے ورنہ گردن ماری جائے گی۔ اِس طریق پر تو تم سارے لوگ جل جاؤ گے اور یہ سوچ کر بھی ہماری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اس لئے جس کروٹ پر جہاں جل رہے ہو وہیں

اُسی کروٹ پڑے رہو ورنہ مار مار کر ہم ٹکڑے اڑا دیں گے۔ شرم نہیں آتی، ہمیں دُکھ دیتے ہوئے؟ ظالم کہیں کے!"

یہ آواز سُن کر پھر کس کی مجال ہے کہ دم مارے اور جگہ تبدیل کرے؟ لیکن اگر اِس حبس دوام سے سخت گھبرا کر اور عواقب سے بےخوف ہو کر کوئی "جلنے والا" یہ سوال کر بیٹھے کہ "اے شاہِ اقتدار! آپ نے ہم سے تمام آزادیاں چھین لیں اور پا بہ زنجیر کر دیا محض اس لئے کہ کسی طرح ہمیں آگ کے اِس خطّے سے نکالیں جسے ہم آگ کا خطّہ نہیں سمجھتے اور اُس سوزش کے عذاب سے بچالیں جس کی جلن کو ہم محسوس نہیں کرتے۔ اے شاہِ اقتدار! ہم اُس آگ کو تو آگ نہیں سمجھتے مگر یہ تلوار کے زور سے ہمارے ہاتھوں سے حکومتیں چھین کر اور آزادیوں کو سلب کر کے جو آگ آپ نے ہمارے سینوں میں بھڑکائی ہے وہ ہمیں جلا کر خاکستر کئے دیتی ہے۔ اسکے بدلہ میں ہم نے کیا پایا؟ ..... کیا ہم ابھی تک اُسی طرح اُسی "خطّۂ نار" میں موجود نہیں جس سے آپ ہمیں نکالنا چاہتے تھے؟ پس اب آپ یہاں کھڑے نظّارہ کیا کر رہے ہیں۔ آگے بڑھئے اور اگر آپ کی ہمدردی کے دعوے سچّے ہیں تو یا تو ہمیں اِس "خطّۂ نار" سے نکال لیجئے جو آپ کے نزدیک خطّۂ نار ہے تاکہ ہمیں آزادی کے سانس نصیب ہوں یا پھر اُس آگ ہی کو ٹھنڈا کر دیجئے جو خود آپ نے ہمارے سینوں میں بھڑکائی

ہے۔"

یہ دردناک پکار سُن کر وہ آواز دینے والا یہ جواب دے گا کہ ان دونوں کیفیتوں میں سے ایک کو بھی تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔

"زیادہ سے زیادہ بادلِ ناخواستہ وہ جس چیز کو گوارا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص خود کُفر پر قائم رہنا چاہتا ہو اُسے اختیار ہے کہ اپنی فلاح کے راستہ کو چھوڑ کر اپنی بربادی کے راستہ پر چلتا رہے اور یہ بھی وہ صرف اس لئے گوارا کرتا ہے کہ زبردستی کسی کے اندر ایمان اُتار دینا قانونِ فطرت کے تحت ممکن نہیں۔"[1]

یہ جواب سُن کر جو کچھ اُس سوالی کے دل پر بیتے گی اُس کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہر صاحبِ دل انسان کر سکتا ہے۔ کیا وہ اُس آتش زار کی دیوار دل سے سر نہ پٹکے گا کہ جب یہ بزرگ جانتے تھے کہ "زبردستی کسی کے دل میں ایمان اُتار دینا قانونِ فطرت کے تحت ممکن نہیں" تو پھر یہ اب تک مجھ سے کیا سلوک فرماتے رہے ہیں؟

---

[1] "مرتد کی سزا" صفحہ ۳۵۔

لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اُس کافر کو اپنے آتشِ زار کی دیواروں سے سر ٹپکنے دیجئے۔ اور اک ذرا وہ بھی سُن لیجیئے۔ جو یہ جواب سُن کر میرے دل پر گزری ہے۔ غالب کے اِس مصرعہ کے مصداق کہ

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب

واقعی دل مختلف قسم کے جذبات کے ہیجان سے ایک طلسم پیچ و تاب بن رہا ہے اور حیرت ہے اور غصّہ ہے اور غم ہے اور سخت تلملاہٹ ہے کہ آخر کیوں وہ غیر فطری افعال جن کے کرنے کی حتیٰ کہ خود مودودی صاحب کو بھی جرأت نہ ہو سکی آپ نے اس جرأت اور دھڑلّے کے ساتھ ہمارے آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی طرف منسوب کئے ہیں؟

خود تو اپنے تصوّر کی دنیا میں۔ اُس دنیا میں جہاں تشدّد کی بادشاہی تھی اور تلواریں گر رہی تھیں اور گردنیں کاٹی جا رہی تھیں جب اُس مقام تک پہنچے جو اس جدّ و جہد کا آخری مقام تھا اور وہ قلعہ جب سامنے آیا جس کا سر کیا جانا ہی مقصود تھا تو ہاتھ لرز گئے اور قدم ڈگمگا گئے اور اس سراسر غیر فطری فعل کے دعویٰ کی بھی جرأت نہ کر سکے۔ اُس وقت انہیں اپنی فطرت کی یہ آواز سُنائی دی کہ

"زبردستی کسی کے اندر ایمان اتار دینا قانونِ فطرت کے تحت ممکن نہیں۔"

میں اُن سے یہ پوچھتا ہوں کہ یہ فطرت کی آواز کیوں گنگ تھی جب وہ میرے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم پر یہ ناپاک الزام لگا رہے تھے۔ کیوں نہ اُنہیں اُس وقت یہ آواز سُنائی دی جب ان کا قلم یہ زہر اُگل رہا تھا کہ:۔

"...... قوم نے آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعئ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی ..... تو رفتہ رفتہ بدی و شرارت کا زنگ چھوٹنے لگا۔"

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا!

اگر وہ اس دعویٰ میں سچے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے تلوار کی طاقت سے دلوں کے زنگ کو دور کیا تھا تو پھر یہ جھوٹ ہے کہ "زبردستی کسی کے اندر ایمان اتار دینا قانونِ فطرت کے تحت ممکن نہیں"۔ اور اگر یہ سچ ہے اور یہی سچ ہے تو پھر وہ جھوٹ تھا کہ میرے آقا نے تلوار کی دھار سے قلوب کے زنگ کو کھرچا تھا مگر ظلم کی حد یہ ہے کہ اپنے لئے تو پیمانہ فطرت ہے اور آقا کے اخلاق کو ہر غیر فطری پیمانے سے ناپا جا رہا ہے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم پر یہ الزام لگا بیٹھے تھے تو کم از کم اخلاق اور وفا کا تقاضا یہ تھا کہ پھر خود بھی اُسی الزام کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ دیتے صحابہ رضوان اللہ علیہم کے عشق کا تو یہ حال تھا کہ ہر اُس وار کو جو اُن کے محبوب آقا پر کیا جاتا تھا اپنے ہاتھوں پر۔ اپنے دلوں پر لیتے تھے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ جنگِ حنین کے موقعہ پر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ اُن تیروں کو روک روک کر جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف پھینکے گئے تھے ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گیا تھا۔ مگر مولانا کا یہ حال ہے کہ تیر روکنے کا تو کیا سوال۔ آنحضرت ؐ کے شدید ترین دشمنوں کی ہمنوائی میں آپ ؐ پر مُہلک اعتراضوں کے تیر برسا رہے ہیں۔ اور جب وہی تیر خود اُن کی طرف پھینکے جاتے ہیں تو دامن بچا کر الگ جا کھڑے ہوتے ہیں۔ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝ ۔۔۔ یہ تو بہت ہی بُری تقسیم ہے!

قتلِ مُرتد ظلم نہیں رحم ہے

یہ بہت ہی بُری تقسیم ہے مگر تقسیمات تو بانٹنے والے پر منحصر ہوا کرتی ہیں اور بانٹنے والے کا طرزِ فکر اپنے فکر کی ہر تخلیق پر اپنی مُہر ثبت کرتا چلا جاتا ہے۔ جس طرح ایک صانع یا ایک مصوّر یا ایک شاعر اپنی صنعت یا تصویر یا شعر سے پہچانا جاتا ہے اور جس طرح وہ صنعتیں یا تصاویر یا اشعار مختلف حالات اور کیفیات کا نتیجہ ہونے کے باوجود ایک خاص رنگ اپنے بنانے والے کا

اپنے اندر رکھتی ہیں اُسی طرح مودودی صاحب کی بھی ہر تخلیق پر اُن کا ایک خاص رنگ غالب ہے اور یہ رنگ سُرخ ہے۔ ہر دیکھنے والا اس رنگ کو سُرخ ہی دیکھتا ہے۔ اور یہی وہ رنگ ہے جس میں مودودی آنکھ اسلام کو رنگین دیکھنے کی عادی بن چکی ہے۔ مگر خدا جانے کیوں۔ اسے فطرت کی آواز کہہ لیجئے یا نظّارہ کرنیوالی آنکھوں کا لحاظ۔ کبھی کبھی مولانا اس رنگ کا نام سبز رکھ دیتے ہیں اور تماش بینوں کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ جسے تم سُرخ دیکھ رہے ہو دراصل یہ سبز ہے۔

قتلِ مرتدّ کے بارہ میں مولانا کے تصوّرات سے تو قارئین رُوشناس ہو ہی چکے ہیں اور ان کے اِس عقیدہ پر بھی ابھی اطلاع پا چکے ہیں کہ زبردستی کسی کو مسلمان نہیں بنایا جاسکتا۔ اس مؤخر الذکر عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب زبردستی مسلمان بنایا ہی نہیں جاسکتا تو پھر اِس سلسلہ میں زبردستی کرنی بھی خلافِ عقل اور ممنوع ہوگی۔ مگر مولانا اس نتیجہ کو تسلیم کرنے پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتے اور اپنی مخصوص طرزِ استدلال کے ذریعہ اپنے اُوپر یہ ثابت کر لیتے ہیں کہ ایمان کی اشاعت کے لئے ہر قسم کا جبر جائز ہے اور اگر اشاعت کے لئے نہیں، تو اسی عذر پر یہ جبر جائز ہے کہ مومنوں کا ایمان محفوظ رہے۔ چنانچہ اس خود حفاظتی کے بہانے ہمسایہ ملکوں پر حملہ کرنا بھی نہ صرف جائز بلکہ بس چلے تو ازبس ضروری ہے۔ ہاں ایک مقام پر جا کر یہ اس عقلی تقاضا کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور وہ مقام قتلِ کافر کا مقام ہے۔ اور خود مولانا کو بھی یہ

تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ایمان نہ لانے کے جرم میں کافر کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والا معاملہ ہے۔ ایک عقلی اعتراض سے تو بچ نکلے دوسرا آن پڑا مشکل اب یہ درپیش ہے کہ جرم کفر میں اگر ایک کافر کو قتل کی سزا نہیں دی جاسکتی تو پھر مرتد کو اسی جرم کی سزا میں کیوں مارا جارہا ہے کیا اُسے زبردستی مسلمان بنایا جاسکتا ہے؟ اگر صرف یہ کہا جائے کہ ایسے شخص کا سوسائٹی میں رہنا سوسائٹی کے لئے نقصان دہ ہے تو جواباً یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح دوسرے کفّار کا سوسائٹی میں رہنا سوسائٹی پر بُرے رنگ میں اثر انداز نہیں ہوتا اُسی طرح اس نئے کافر کا حال ہوگا اور اگر وہاں بھی برداشت ہوتا ہے تو یہاں بھی برداشت کرلیں۔ جو پابندیاں آپ دوسرے کفّار پہ عائد کرتے ہیں اِس نو کافر پر بھی عائد کر دیجئے۔ زیادہ سے زیادہ گھر بدر بلکہ ملک بدر کر دیجئے۔ عمر قید کی سزا دے دیجئے۔ یہ قتل کا بھلا کیا جواز ہوا۔ یہ تو صریح ناانصافی اور ظلم ہے۔ تو یہ جواب سُن کر مولانا ہمیں خبر دیتے ہیں کہ نادانو! آنکھ کے اندھو یہ ظلم نہیں یہ تو رحم ہے۔ دکھائی نہیں دیتا تو پوچھ ہی لیا کرو۔ اپنے الفاظ میں اس رحم کی تفصیل مولانا یوں بیان فرماتے ہیں :-

"اُس کے لئے دو ہی علاج ممکن ہیں۔ یا تو اُسے اسٹیٹ میں تمام حقوقِ شہریت سے محروم کرکے زندہ رہنے دیا جائے۔ یا پھر اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ پہلی صورت فی الواقع دوسری

صورت سے شدید تر سزا ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْییٰ کی حالت میں مبتلا رہے۔۔۔

۔۔۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ اُس کو موت کی سزا دے کر اُس کی اور سوسائٹی کی مصیبت کا بیک وقت خاتمہ کر دیا جائے۔"[1]

کیا یہ بعینہٖ اُس سُرخ پوش کی آواز کی سی آواز نہیں ہے جو مجمع میں کھڑا حاضرین کو یہ یقین دلا رہا ہو کہ "اندھو۔ نابیناؤ۔ مان لو کہ میرے کپڑوں کا رنگ سبز ہے"۔

لیکن اگر رنگ واقعی سبز ہے اور ہم نے غلطی کھائی ہے تو مولانا کو میرا مشورہ یہی ہے کہ ذرا دھیمی آواز میں بات کریں۔ اگر اُس آتشِ زار کے بسنے والے کفّار کے کانوں تک یہ آواز جا پہنچی جن کا ابھی کچھ دیر پہلے تذکرہ گذرا ہے تو کیا انہیں اس خیال سے دھکّا نہیں لگے گا کہ "دعوے تو یہ تھے کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے تمہاری ہی ہمدردی اور بہبود کی خاطر ہے مگر جب قسمتوں کی تقسیم کا وقت آیا تو رحم تو اپنوں کی جھولی میں ڈال دیا اور ظلم ہمارے دامن میں۔ حالانکہ جُرم دونوں کا ایک ہی نوعیّت کا تھا۔" وہ کفّار مولانا کے متعلق کیا کیا نہ خیال دل میں لائیں گے اور کیسے کیسے ظن اُن پر نہ کریں گے؟ اس لئے بہتر ہے کہ یہ اپنی آواز کو دھیما

---

[1] "مرتد کی سزا" صفحہ ۵۱۔

کریں اور کیوں نہ بس اسی امر پر اکتفا ہو جائے کہ قتل سے کچھ دیر پہلے صرف مرتدین کے کانوں ہی میں سرگوشی کر دی جائے کہ میاں غلط فہمی میں مبتلا نہ رہنا۔ فی الواقعہ تم سستے چھوٹے ہو اور تم سے استثنائی طور پر رحم کا سلوک کیا گیا ہے۔ اور جاتے جاتے مزید ہمدردی کے اظہار کے طور پر اُن کا ہاتھ بھی دبا دیا جائے اور رازداری کے رنگ میں نظریں ملا کر مسکراتے ہوئے' اور اگر حُسنِ اتفاق سے کوئی کافر وہاں موجود ہو تو اُس کی طرف سر کا اشارہ کرتے ہوئے یہ الفاظ بھی بڑھا دیئے جائیں کہ دیکھتے نہیں ان لوگوں کا کیا حال ہے؟ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی۔ نہ تو یہ مرتا ہے نہ زندہ رہتا ہے۔

مگر مودودی صاحب یہ ہمدردانہ سلوک تجویز فرماتے ہوئے غالباً ایک بات بھول گئے کہ اسلام کے نزدیک موت فی ذاتہٖ انجام نہیں ہے بلکہ اس کے بعد پھر ایک زندگی ہوگی جس کا نام اسلام حیاتِ آخرت رکھتا ہے۔ اس لئے دراصل یہ اُس مُرتد کی مصیبت کا خاتمہ نہیں فرما رہے ہوں گے بلکہ اُسے سیدھا جہنم واصل کر رہے ہوں گے۔ اُن کی اِس دنیا کی امکانی زندگی کے متعلق (جس سے مولانا اُس مصیبت زدہ کو نجات دلا رہے ہیں) تو یہ ایک انسانی رائے تھی کہ وہ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی والی حالت کے مصداق ہے مگر جہاں اُسے اب بھجوا رہے ہیں اُس کے متعلق تو خود خدا فرماتا ہے کہ " لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی" ٥ نہ تو (وہ بدبخت) اُس میں

مرے گا نہ زندہ رہے گا۔ صرف اسی پر بات ختم نہیں ہو جاتی بلکہ موازنہ اس سے بھی بدتر ہے۔ مولانا تو اُسے جس آگ سے نجات دینے کے لئے ازراہِ شفقت مار رہے تھے وہ خود اُن کے ہاتھوں کی بھڑکائی ہوئی تھی اور زیادہ سے زیادہ ہم اُسے نارِ صغریٰ کہہ سکتے ہیں یعنی چھوٹی آگ۔ مگر اب جس آگ کی طرف اُسے بھجوا رہے ہیں اُس کا نام خود خدا تعالیٰ نے "اَلنَّارُ الْکُبْرٰی" رکھا ہے یعنی بڑی آگ۔ پس مولانا کا یہ مصیبتوں سے نجات دلانے کا عجیب طریق ہے کہ ایک لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی کی حالت سے نکال کر دوسری شدید تر لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی کی حالت میں دھکیل رہے ہیں۔ اور ایک ہلکی آگ سے نجات دیکر دوسری بڑی آگ میں جھونک رہے ہیں اور ابھی یہ خاص رحمت اور نرمی کا سلوک ہے۔ اور یہ اعلان بھی جاری ہے کہ یہ رنگ سُرخ نہیں ہے سبز ہے۔

کافر کو تو پھر کچھ اُمید ہو سکتی تھی کیونکہ ابھی اُس نے اپنی طبعی موت تک خدا جانے کتنے برس دیکھ بھال کے کاٹنے تھے اور خدا جانے کتنے مواقع اُسے میسر آنے تھے کہ حق و باطل میں تمیز کر کے اُخروی نجات کو پا لیتا مگر یہ مجبور مُرتد کہ جس کی رگِ جان کے ساتھ ہی نجات کی سب اُمیدیں منقطع کر دی گئیں دوسری دنیا میں آنکھ کھولتے ہی جب جہنم کی طرف لے جایا جا رہا ہو گا تو خدا جانے اُن ہاتھ دبانے والوں کے متعلق کیا سوچ رہا ہو گا جنہوں نے قتل

سے پہلے اُسے یہ یقین دلایا تھا کہ یہ سب کچھ اُس کی فلاح اور بہبودی کی خاطر کیا جا رہا ہے۔

آخر میں میں پھر قارئین کی یاد کو تازہ کرنے کی غرض سے اشاعتِ اسلام کے بارہ میں مودودی صاحب کی پالیسی کے تمام نکات کو مختصراً بیان کر دیتا ہوں :۔

(۱) غیر اسلامی ممالک کو دعوتی کارڈ بھجوائے جائیں مگر طاقت پاتے ہی خصوصاً ہمسایہ ممالک پر حملہ کر دیا جائے۔

(۲) کافروں کو مسلمانوں میں تبلیغ سے منع کر دیا جائے۔

(۳) کافروں کو کافروں میں تبلیغ سے منع کر دیا جائے۔

اس کے علاوہ میرے نزدیک لازماً قتلِ مُرتد کا مسئلہ بھی اسی پالیسی کا جزء ہے اور دراصل یہ چار نکاتی پروگرام کہلانا چاہیئے تھا مگر مشکل یہ ہے کہ مولانا کو مجھ سے اتفاق نہیں۔ میرے نزدیک یہ اس پالیسی کا حصہ اس لئے ہے کہ طبعاً قتل کے خوف سے بہت سے مسلمان دوسرے مذاہب اختیار کرنے سے رُک جائیں گے۔ مثلاً پچھلے دنوں پاکستان میں ایک خاصی تعداد میں مسلمانوں نے عیسائیت اختیار کی اگر یہ طریقِ قتل رائج ہوتا تو شاید مشکل سے ان مرتدین میں سے ایک آدھ ہی ایسا رہ استباز نکلتا کہ "منافق بن کر زندہ رہنا" پسند نہ کرتا۔ مگر مولانا کے نزدیک یہ اس پالیسی کا حصہ نہیں ہے اور

اس کا مقصد یہ نہیں کہ اس طرح مسلمانوں میں منافق پیدا کئے جائیں، چنانچہ لکھتے ہیں:-

"قتلِ مرتد کو یہ معنی پہنانا بھی غلط ہے کہ ہم ایک شخص کو موت کا خوف دلا کر منافقانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ دراصل معاملہ برعکس ہے۔ ہم ایسے لوگوں کے لئے اپنی جماعت کے اندر آنے کا دروازہ بند کر دینا چاہتے ہیں۔ جو تلوّن کے مرض میں مبتلا ہیں اور نظریات کی تبدیلی کا کھیل تفریح کے طور پر کھیلتے رہتے ہیں ....

...... لہذا یہ عین حکمت و دانش ہے کہ ہر اس شخص کو جو اس جماعت کے اندر آنا چاہے پہلے ہی مطّلع کر دیا جائے کہ یہاں سے پلٹ کر جانے کی سزا موت ہے تاکہ وہ داخل ہونے سے پہلے سَو مرتبہ سوچ لے کہ اُسے ایسی جماعت میں داخل ہونا چاہیئے یا نہیں۔ اس طرح جماعت میں آئے گا ہی وہ جسے کبھی باہر جانا نہ ہوگا۔[۱]"

مجھے یاد ہے قیامِ پاکستان سے پہلے ہندوستان کی اشتراکی

---

[۱] "مرتد کی سزا" صفحہ ۵۲-۵۲ +

پارٹی کا بھی بعینہٖ یہی طریق تھا۔ وہ اپنی خفیہ سوسائیٹیوں کا ممبر بنانے سے پہلے ہر آنے والے کو یہ تنبیہ کر دیا کرتے تھے کہ میاں! باہر جانے کی سزا موت ہو گی۔ —— زراعتی کالج لائل پور کا ایک طالب علم جسے میں جانتا تھا بے چارہ اِسی جُرم میں مارا گیا تھا —— مگر یہ تو ضمناً مجھے ایک بات یاد آگئی تھی جو مَیں نے کر دی کیونکہ اِس سے میرے اِس نظریہ کو مزید تقویت پہنچتی ہے کہ مودودیت میں اشتراکیت کا رنگ غالب ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ مولانا نے کچی عمر میں لینن یا مارکس کے بعض اُردو ترجمے پڑھ لئے ہوں اور آئندہ زندگی کے تصوّرات ڈھالنے میں اُنہوں نے ضرورت سے زیادہ کام کیا ہو مگر اِس ذکر کو مَیں چھوڑتا ہوں۔ اِس وقت اصل مبحث یہ نہیں تھا۔

مَیں مولانا مودودی کی قتلِ مرتد کی وہ توجیہہ لکھ رہا تھا جسے سُننے کے بعد پھر میرا یہ حق نہیں رہتا کہ قتلِ مرتد کے عقیدہ کو بھی اشاعتِ اسلام کی پالیسی کا ایک جزو بتاؤں۔ چنانچہ مَیں نے ایسا نہیں کیا اور محض تین نکاتی پروگرام پیش کیا ہے۔ بس اب اِس حصّہ مضمون کو ختم کرتا ہوں مگر جانے سے پہلے مودودی صاحب مجھے اجازت دیں کہ اُن کی پیش کردہ مندرجہ بالا توجیہہ کے متعلق ایک دو سوال پیش کر دوں۔ وہ سوال یہ ہیں کہ :۔

اوّل :۔ اگر آپ کا یہ دعویٰ درست ہے کہ قتلِ مُرتد کا اصل مقصد یہی ہے کہ آپ " ایسے لوگوں کے لئے اپنی جماعت کے اندر آنے کا

راستہ بند کر دینا چاہتے ہیں" تو یہ فرمائیں کہ عام انسانی پیدائش کے طریق پر اس مزاج کے جو مسلمان آپ کی سوسائٹی کے اندر مسلسل داخل ہوتے رہیں گے اُن کی روک تھام کے لئے آپ نے کیا تجویز سوچی ہے۔ اور

دوم:- اگر "عین حکمت و دانش" یہی ہے کہ "ہر اُس شخص کو جو جماعت کے اندر آنا چاہے پہلے ہی مطلع کر دیا جائے کہ یہاں سے پلٹ کر جانے کی سزا موت ہے"۔ تو وہ کون سے ذرائع ہیں جن کو اختیار کر کے پیدائش سے پہلے ہی مسلمانوں کو خبردار کر دیا جائے گا کہ اگر آنا ہے تو "سو مرتبہ سوچ کر آؤ"۔

لازم تھا کہ خلافِ فطرت عقائد کی توجیہات بھی خلافِ فطرت ہی ہوں؟

مودودی دورِ حکومت کی ایک امکانی جھلک

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا!

گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے قارئین پر وہ تصوّر خوب واضح ہو چکا ہوگا جو مولانا مودودی اسلام، اسلام کے رسول، اسلام کی اشاعت اور اسلام کے اقتدار کے بارہ میں رکھتے ہیں۔ اب میں ان صفحات میں اس امکانی مودودی حکومت کا ایک مختصر سا خاکہ کھینچ کر دکھاتا ہوں جو مودودی صاحب

حصولِ اقتدار کے بعد کسی اسلامی یا غیر اسلامی ملک کے پردہ پر رونما ہوگی۔ میرے غیر اسلامی کہنے پر تعجب نہ کریں کیونکہ حقیقتاً یہ بعید نہیں کہ پہلے کسی اسلامی ملک میں ظہور پذیر ہونے کی بجائے یہ انقلاب کسی غیر مسلم اکثریت کے ملک میں ظاہر ہو جائے کیونکہ جب "ہر مسلم پارٹی" اپنے اپنے ملک میں یہ مزعومہ "اسلامی انقلاب" لانے کی کوشش میں مصروف ہوگی اور حصولِ اقتدار کا ہر ممکن ذریعہ اختیار کیا جا رہا ہوگا تو کون کہہ سکتا ہے کہ کہاں یہ انقلاب پہلے آئے گا؟ سعودی عرب میں یا غانا میں؟ مصر میں یا لبنان میں؟ پاکستان میں یا ہندوستان میں؟

بہرحال جب بھی، جس طرح بھی اور جہاں بھی یہ اسلامی حکومت رونما ہوگی اس کے کچھ مخصوص نقوش ہوں گے جن پر اس وجود کے طرزِ فکر کی نہ مٹنے والی مُہر ثبت ہوگی جس کے ذہن نے اس کا تصوّر قائم کیا اور جس کی کوششیں تصوّرات کے عالم سے اُسے عالمِ وجود میں لے آئیں۔ سب سے پہلا عملی قدم جو حصولِ اقتدار کے بعد اُٹھایا جائے گا وہ غالباً یہ ہوگا کہ اسلام کے عنوان کے تحت مودودی عقائد کی ایک فہرست شائع کی جائے گی اور یہ اعلانِ عام کیا جائیگا کہ کسی معیّن مدّت کے اندر اندر وہ تمام مسلمان جو اِن عقائد کے قائل ہیں، نزدیک ترین تھانوں یا عدالتوں میں اپنے نام درج کروا دیں۔ اگر وقتِ مقررہ کے اندر کوئی مسلمان رجسٹر ہونے سے رہ گیا تو اپنی جان، مال اور عزت کا وہ

خود ذمہ دار ہوگا نیز اس عرصہ کے اندر اندر تمام رعایا اپنے ہتھیار جمع کروا دے۔

اس اعلان کے بعد حکومت فوری طور پر قتل و غارت کی تیاری میں مصروف ہو جائے گی اور مودودی فوج اور مودودی پولیس اپنے ہتھیاروں کو صیقل کر لے گی اور ایک ایسے جہاد کے لئے کمر ہمت کسنے لگے گی جس میں محنت اور مشقت تو بہت ہو گی مگر شہادت کا کوئی خطرہ نہ ہو گا کیونکہ اس معین دن سے پہلے پہلے دشمن کو نہتہ کیا جا چکا ہو گا۔

ایک بے چین عرصۂ انتظار کے بعد آخر وہ دن آ جائے گا جبکہ کروڑوں ایسے مرتدین کی گردنیں مودودی تلواروں کے لئے حلال کر دی جائیں گی۔ جو مرتدین پہلے پیدائشی مسلمان کہلاتے تھے چنانچہ ایک آواز دینے والے کی آواز پر خدا جانے کتنی تلواریں اٹھیں گی اور گریں گی اور کتنے سر تن سے جدا ہونگے اور کتنے بدن خاک و خون میں غلطاں ہوں گے! —— اگر مولانا مودودی کے اقوال اور افعال میں کوئی فرق نہیں اگر وہ وہی سب کچھ کر بھی سکتے ہیں جو وہ کہتے ہیں تو ایسا ہی ہو گا اور نہ جانے کتنی تلواریں ایک مرتبہ نہیں ہزار مرتبہ اٹھیں گی اور ہزار مرتبہ گریں گی اور سر تن سے جدا ہوتے رہیں گے اور بدن خاک و خون میں غلطاں لوٹیں گے۔

وہ وقت ایسا ہو گا کہ اگر خاوند نے توبہ کر لی یا راستی کی راہ سے ہٹ گیا تو خود اُسے تو زندہ رکھا جائے گا مگر اس کی بیوی اس کی آنکھوں کے

سامنے تہ تیغ کی جائے گی اور اگر بیوی نے توبہ کر لی یا جھوٹ بول کر منافقت کی راہ اختیار کی تو وہ خود زندہ رکھی جائیگی مگر اس کا راستباز خاوند اس کی آنکھوں کے سامنے ہلاک کیا جائے گا بچے بلا استثناء زندہ رکھے جائیں گے اور بہر حال اپنی ماں یا باپ یا ماں باپ کو مرتا ہوا دیکھیں گے اور ان دودھ پیتے بچوں کے بلکنے سے جن کی بے قرار آنکھیں مرتد ماؤں کو ترسیں گی اور ان یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کی گریہ وزاری سے جن کی روتی ہوئی آنکھیں پھر کبھی ان مرتد باپوں کو نہ دیکھ سکیں گی۔ . . . .

. . . پاکستان کی بستی بستی قریہ قریہ سے وہ نعرہ ہائے ورد بلند ہوں گے کہ ان کی چیخ و پکار کنگرۂ عرش کو ہلا دیگی اور ایک طرف توچین کی دیواریں کانپیں گی اور دوسری طرف یورپ پر لرزہ طاری ہوگا اور جب ان چند ایک صالحین کے بازو گردنیں مارتے مارتے شل ہو جائیں گے تو الٰہی مرتدین سے وسیع و عریض کھائیاں کھدوا کر ان میں سرخ آگ بھڑکائی جائے گی۔ اور رہے سہے مرتدین کو زندہ آگ میں جلا دیا جائے گا۔ اور اس آگ کی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی لپٹیں پاکستان کے شمال اور جنوب مشرق و مغرب کو روشن کر دیں گی۔ پس وہ کیسی مبارک صبح ہوگی جب افقِ پاکستان سے مودودیت کا یہ سرخ سویرا طلوع ہوگا!

مگر یہ تو محض ایک ابتداء ہے اور انتہائے سے پہلے ابھی کئی ایک منازل

طے کرنی باقی ہیں۔ اگر سب سے پہلا انقلابی ملک پاکستان ہوا تو ابھی تو کتنے ہی اسلامی ممالک کے وسیع و عریض خطے پاکستان کے دائیں اور بائیں اور آگے اور پیچھے پھیلے پڑے ہیں جہاں "مرتد مائیں" "مرتد بچے" جن رہی ہیں۔ اور ابھی تو ہندوستان کے "چھ کروڑ مرتدین" کا صفایا باقی ہے۔ ابھی باقی ہے وہ نوحہ جو پہاڑوں کے سینے پھاڑ دے گا اور آسمان کے پردے چاک کر دے گا۔ اور وہ گریہ باقی ہے جسے سن کر زمین کی چھاتیوں کا دودھ خشک ہو جائے گا اور آسمان کے ستارے سینہ کوبی کریں گے اور جس کے درد سے چاند سورج کی آنکھیں بھی روتے روتے اندھی ہو جائیں گی!

پھر کیا اس وسیع قتل و غارت کے بعد جبکہ تمام اسلامی ممالک اکثر مسلمان آبادیوں سے خالی ہو چکیں گے۔ ان ذی اقتدار "حقیقی مسلمانوں" کی پیاس بجھ جائے گی اور ہوسِ اقتدار کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے گی؟ —— اگر ان بلند عزائم کو دیکھا جائے جو مولانا کے دل میں جوش مارتے ہیں اور نوکِ زبان اور قلم سے جاری ہوتے رہتے ہیں تو اس سوال کا جواب نفی میں ہے نہیں۔ ابھی یہ پیاس نہیں بجھے گی اور یہ آگ ٹھنڈی نہ ہوگی جب تک کہ کفار حکومتوں کو دعوتِ اسلام بھجوانے کے بعد اُن کے اصرارِ کفر پر یا اس کا انتظار کئے بغیر ہی بزورِ شمشیر مقہور نہ کر لیا جائے۔ ابھی تو ان کے غضب کی بجلی نے یورپ پر بھی گرنا ہے اور امریکہ پر بھی۔ چین پر بھی اور جاپان پر بھی آسٹریلیا پر بھی اور نیوزی لینڈ

پر بھی - ابھی تو اس کے کوندوں نے افریقہ کے صحراؤں پر چمکنا ہے اور سیاہ جنگلوں کو آگ لگانی ہے - ابھی تو اس نے روس کو نذرِ آتش کرنا ہے اور سائبیریا کی یخ بستہ ترائیوں کو شعلۂ ایمان بخشنا ہے - ابھی تو کتنے ہی قتل و غارت کے بازار گرم ہونے باقی ہیں! - ابھی مودودی تلواروں نے کتنے ہی اور گھاٹوں کا سُرخ پانی پینا ہے - اور میں یہ سوچتا ہوں کہ جب یہ مودودی اسلام زمین کے چپہ چپہ کو لالہ رنگ کر چکے گا تو ہزاروں ہزار میل تک ویرانوں میں کسی تنہا "صالح مسلمان" کی صدائے اذان کیسی بھلی معلوم دے گی - اور میں سوچتا ہوں کہ مولانا کا امنِ عالم کا اسلامی تصور کتنا بھیانک ہے کہ جس امن کی تصویر چُپ چاپ خاموش قبرستانوں میں نظر آتی ہے اور جس کا دوسرا نام زندگی کا فقدان ہے - موت ہے -

منافقین کی ایک عالمگیر جماعت

اور اگر یہ قتل و غارت کا بازار گرم نہ ہوا تو صرف ایک صورت میں ... صرف ایک صورت میں کہ دنیا کے پردہ پر منافقین کی ایک عظیم عالمگیر جماعت ظہور پذیر ہو ورنہ اس تلوار سے بچنے کا کوئی امکان نہیں -

ناظرین اسے افسانہ یا شاعری خیال نہ کریں اگرچہ یہ درست ہے کہ جب مودودی عزائم کا عمل کی دنیا میں نقشہ کھینچ کر دیکھا جائے تو وہ ایک ہولناک افسانہ معلوم ہوتا ہے یا ایک خوفناک خواب یا ایک شاعر کا دل ہلا دینے والا تصور -

مگر افسوس کہ نہ تو یہ خواب ہے نہ کوئی افسانہ نہ شاعرانہ تصوّر بلکہ ایک جیتی جاگتی بظاہر سوچنے کی طاقت رکھنے والی علمِ دین وفہم رسالت رکھنے کی دعویدار ہستی کے وہ نظریات ہیں جو وہ آج اسلام کے نام پر دنیا کے سامنے پیش کر رہی ہے اور اس تحدی کے ساتھ کہ جب بھی موقعہ ملا ان دعاوی پر عمل کر کے دکھایا جائے گا۔

یہ ہے وہ اسلام کے عالمگیر غلبہ کا دن جو مودودی تصوّر کی کھڑکیوں سے جھانک رہا ہے۔ کیا نعوذ باللہ اسی دن کو کھینچ لانے کے لئے آج سے تقریباً چودہ سو برس پہلے افقِ عرب سے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے نیّرِ عالم تاب کا ظہور ہوا تھا؟

اے کاش مولانا مودودی اپنے مذہب کو اسلام کے سوا کوئی اور نام دے لیتے اور ہمارے آقا کے نام کو اپنے اس کریہہ المنظر تاریک و تار تصوّر میں ملوّث نہ کرتے لیکن اگر ایسا کرتے تو کون اُن کی پیروی کرتا اور کون اُن کو اِس نئے مذہب کے نام پر ووٹ دیتا۔ اِس لئے اُن کے سامنے صرف ایک راہ باقی تھی اور وہ راہ یہی تھی کہ اپنے آمرانہ خیالات کو ہمارے معصوم آقا کی طرف منسوب کر کے رائج کرتے۔ پس انہوں نے ایسا ہی کیا اور امن اور سلامتی کے اُس رسول کے نام کو بھی اس کُشت و خون کے میدان میں گھسیٹنے سے گریز نہیں کیا جس رسول کا ایک ایک سانس امن کا پیغام لے کر آتا تھا۔ جس کے مذہب

کا نام ہی اسلام تھا!

مَیں نے عمداً اس امکانی نقشہ کو کھینچتے ہوئے حتی الامکان اختصار اور احتیاط سے کام لیا ہے اور صرف انہی نقوش کی تصویر کشی کرنے پر اکتفاء کی ہے جو واضح اور غیر مشکوک طور پر مولانا کی مختلف کتب میں ملتے ہیں اور جن کے اقتباسات گذشتہ صفحات میں قارئین کی خدمت میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ ویسے مودودیت کے مزاج کو سمجھ لینے کے بعد یہ کچھ مشکل نہیں رہتا کہ انسان ہر دائرہ حیات میں ایک امکانی مودودی حکومت کی صحیح صحیح تصویر اتار سکے۔

مثلاً اُس دور کے تمدنی حالات کا نقشہ کھینچا جا سکتا تھا یا ڈنڈے کے زور سے عبادات کروانے پر جو مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا ہو سکتی ہے اُس کا ذکر کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح اس حکومت کے بین الاقوامی تعلقات پر بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا اور اُن کوششوں کا تصور بھی باندھا جا سکتا تھا جن کے ذریعہ ملک سے بددیانتی، رشوت ستانی اور بدمعاملگی کو دُور کرنے کی کوشش کی جاتی اسی طرح ملک کے سیاسی حالات کا نقشہ پیش کرنا بھی کچھ مشکل نہ تھا۔ ایک ایسا ملک جس کی بناء ہی نظریۂ تشدّد اور خونریزی پر ہو وہ بغاوتوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور اگر اس ملک میں منافقین کی کثرت ہو تو پھر تو یہ خطرہ غیر متناسب طور پر بڑھ جاتا ہے بلکہ جُوں جُوں وقت گذرتا جائے ایسی حکومت کیخلاف ردِّ عمل بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ پس اِن تمام امکانی خطرات کے بارہ میں بہت کچھ

لکھا جا سکتا تھا جو ایسی حکومت کو یقیناً پیش کر سکتے ہیں اس کے علاوہ دوسری قسم کی سازشوں کا تصوّر بھی باندھا جا سکتا تھا اور رائس خفیہ نظام جاسوسی کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا تھا جس کے ذریعے سے حکومت اِن سازشوں اور بغاوتوں کا پتہ لگاتی۔ اور عذاب دینے کے اُن ذرائع کا ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوتا جو ایسی حکومت نے مزید معلومات یا خالص صداقت معلوم کرنے کے لئے بہرحال اختیار کرنے تھے۔ مگر میں اِن سب امور سے قطع نظر کرتا ہوں اور قارئین کے انفرادی رجحان یا ذوق پر معاملہ چھوڑتا ہوں تاہم اگر کسی دوست کو مزید تجسّس ہو تو مؤخّر الذکر امر کے بارہ میں واقعاتی نقشے اشتراکی انقلاب کی تاریخ یا "History of the Priest-Craft In All Ages" "ہسٹری آف دی پریسٹ کرافٹ اِن آل ایجز" میں بکثرت مل سکتے ہیں جن کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

مہلت اور معافی نامہ کا ایک فرمانِ عام

آخر پر یہ باب ختم کرنے سے پہلے اگر میں اس عام مہلت اور معافی نامہ کا ذکر نہ کردوں جسے جاری کرنے کے امکان کا مودودی صاحب اظہار فرما چکے ہیں تو یہ اُن سے ناانصافی ہوگی جیسا کہ میں نے باب کی ابتداء میں ہی اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ میرا خیال ہے کہ مودودی حکومت اقتدار حاصل کرتے ہی ایک عام فرمان جاری کرگی

اور یہی دستور ہر انقلابی حکومت کا ہوا کرتا ہے۔ اور اس فرمان کے مطابق مسلمانوں کو بعض مخصوص عقائد کو مدّنظر رکھتے ہوئے بحیثیت مسلمان رجسٹر ہونا پڑے گا کم و بیش اسی مضمون کے فرمان جاری کرنے کے امکان کا اظہار مودودی صاحب نے اپنی کتاب "مرتد کی سزا۔۔۔۔" کے آخر پر فرمایا ہے۔ فرق یہ ہے کہ میرے نزدیک تو جو لوگ اس وقت مودودی اصطلاح کے مطابق "مسلمان" قرار نہیں دیئے جاسکیں گے انہیں بہرحال تہہ تیغ کیا جائے گا مگر مودودی صاحب نے اس امکان کا ذکر کیا ہے کہ چونکہ اس طرح ایک بے نظیر اور بے شمار قتلِ عام لازم آئے گا اس لئے ممکن ہے اُن کو فی الفور قتل کرنے کی بجائے صرف امّت سے خارج کر کے کافر ذمیوں کی طرح زندہ رہنے پر مجبور کرنے کو ہی کافی سمجھا جائے لیکن اس کے بعد اگر بقیہ مسلمانوں میں سے کوئی مسلمان اعتقاداً یا عملاً کافر ہو تو اُسے بہرحال قتل کیا جائے۔ مگر مولانا کے اِس شاہانہ معافی نامہ کے باوجود میں نے اپنے پیش کردہ نقشہ میں جو قتلِ عام کا مختصر سا خاکہ کھینچا ہے اُس کی بعض وجوہات ہیں۔

۱۔ اوّل تو یہ کہ خود مولانا کی طرف سے بھی کسی یقینی معافی نامہ کا اعلان نہیں بلکہ مشکل سے صرف ایک امکانی حل کا ذکر ہے اور مجھے یقین ہے کہ حصولِ اقتدار کے بعد اس "نرمی" کے سلوک کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا کیونکہ خود مولانا ہی کے الفاظ ہیں:۔

"حکومت اور فرمانروائی جیسی کچھ بدبلا ہے ہر شخص اس کو جانتا ہے۔ اس کے حاصل ہونے کا خیال کرتے ہی انسان کے اندر لالچ کے طوفان اُٹھنے لگتے ہیں۔ خواہشات نفسانی یہ چاہتی ہیں کہ زمین کے خزانے اور خلقِ خدا کی گردنیں اپنے ہاتھ میں آئیں تو دل کھول کر خدائی کی جائے[1]۔"

۲- دوسری وجہ میرے اس یقین کی یہ ہے کہ اس معافی نامہ کو صادر فرمانے پر آمادہ گی ہیں مولانا سے ایک غلطی ہوگئی ہے جسے وہ جلد یا بدیر خود محسوس فرمالیں گے یا شاید ان کا ہم خیال اس طرف ان کی توجہ مبذول کروادے غلطی یہ ہے کہ اگر اسلامی قانون میں مرتد کی سزا قتل ہے اور وہ پیدائشی مسلمان بھی جو بڑے ہو کر اعتقاداً یا عملاً اسلام سے منحرف ہو چکے ہوں اس قانونِ شریعت کی رُو سے واجب القتل ہیں تو مولانا کو یہ اختیار کہاں سے حاصل ہو گیا کہ وہ اِن مجرموں کو معاف کرتے پھریں۔ کیا وہ کوئی نئی شریعت بنائیں گے یا شریعت کے کسی حکم کو منسوخ یا تبدیل کرنے کا حق رکھتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر کوئی چارہ نہیں اِس کے سوا کہ یا تو اس شریعت سے منحرف ہو کر خود مرتدین کے زُمرہ میں جا بیٹھیں

---

[1] حقیقتِ جہاد ص۱۵

یا پھر بادلِ ناخواستہ قتلِ عام کا حکم جاری فرمائیں۔ خواہ کروڑوں کروڑ آدمی اس کی زد میں آئیں۔

۳۔ مولانا ایک اور بات بھی بھول گئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب خود مولانا کو یہ تسلیم ہے کہ اِن دو صورتوں میں سے کہ

"یا تو اُسے اسٹیٹ میں تمام حقوقِ شہریت سے محروم کرکے زندہ رہنے دیا جائے یا پھر اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ پہلی صورت فی الواقع دوسری صورت سے شدید تر سزا ہے کیونکہ اُس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لایموت فیھا ولا یحیٰ کی حالت میں مبتلا رہے"[1]

تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ جب مولانا نرمی اور رحم کے مزاج میں ہوں تو دو صورتوں میں سے ایسی سزا تجویز فرمائیں جو "فی الواقع دوسری صورت سے شدید تر سزا" ہو۔

اِن وجوہ کی بناء پر مَیں مجبور تھا کہ اپنے پیش کردہ نقشہ کو اُسی طرح پیش کروں جس طرح مَیں نے پیش کیا ہے۔ کیونکہ مودودی حکومت کے ساتھ قتل و غارت کا تصور "تشدد کی ایسی مضبوط آہنی زنجیروں سے باندھا جا چکا

---

[1] مرتد کی سزا صفحہ ۵۱۔

ہے کہ خود اِن زنجیروں کا خالق بھی اگر چاہے کہ انہیں کھول کر یا توڑ کر اِس تصوّر کو الگ کر دے تو یہ اُس کے قبضۂ قدرت میں نہیں رہا ؎

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر!

اِس معذرت کے بعد اب میں وہ الفاظ نقل کرتا ہوں جو خود مودودی صاحب کے الفاظ ہیں تاکہ اگر مَیں نے کسی نتیجہ تک پہنچنے میں غلطی کھائی ہو تو احباب خود درستی فرمالیں :-

"اگر آگے چل کر کسی وقت اسلامی نظامِ حکومت قائم ہو (خیال رہے کہ یہ مضمون ۱۹۴۲ء میں لکھا گیا تھا - ناقل) اور قتلِ مرتد کا قانون نافذ کر کے اُن سب لوگوں کو بزور اسلام کے دائرے میں مقیّد کر دیا گیا جو مسلمانوں کی اولاد ہونے کی وجہ سے اسلام کے پیدائشی پیرو قرار دیئے جاتے ہیں۔ تو اِس صورت میں بلاشبہ یہ اندیشہ ہے کہ اسلام کے نظامِ اجتماعی میں منافقین کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہو جائے گی جس سے ہر وقت ہر غدّاری کا خطرہ رہے گا۔

میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے ، واللہ المُوَفِّقُ للصّواب کہ جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رُونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ

"جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظام اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد اُن سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانینِ اسلامی اُن پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر اُنہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اُسے قتل کر دیا جائے گا"۔

اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے گی کہ جسقدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے۔ بچا لیا جائے۔ پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے اور اس عمل تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں[1]"۔

---

[1] مرتد کی سزا صفحہ ۸۱

اِس اقتباس پر میرا بس اتنا سا تصرف ہے کہ نوٹس والے حصّہ کو تحریر سے پیوستہ لکھنے کی بجائے الگ پیرا بنا کر لکھا گیا ہے ورنہ مضمون اور الفاظ من و عن مودودی صاحب کے ہی ہیں۔ دیکھئے اِس اصلاحِ خلق کے تصوّر میں کس قدر بچگانہ خوش فہمی پائی جاتی ہے۔ جیسے کوئی جنوں پریوں کی دُنیا میں بس رہا ہو۔ حکومت نہ ہوئی الہ دین کا چراغ ہو گیا اور اصلاحِ خلق نہ ہوئی برف کے محل کی تعمیر ہو گئی۔ لیکن اگر واقعی ایسا ہی ہے اور حکومت الہ دین کا چراغ ہی ہے اور اصلاحِ خلق برف ہی کا محل ہے کہ جس کی تعمیر اس چراغ کے جن کے لئے کچھ مشکل نہیں تو مَیں یہ پوچھتا ہوں کہ اگر یہ چراغ کھویا گیا؟ — مجھے اِس وقت انبیائے گذشتہ کا بہت خیال آرہا ہے۔ کتنے ہی اُنمیں سے ایسے تھے کہ جن کی ساری زندگی سخت مظلومی کی حالت میں کٹی۔ کاش انکو بھیجتے وقت بھی خدا تعالیٰ یہ چراغ اُن کے ہاتھوں میں تھما دیتا! کچھ اُنکے دُکھ دُور ہوتے کچھ دنیا کے دلدّر۔ تاریکیاں چھٹ جاتیں اور ہر طرف ہدایت کا نور بکھر جاتا۔

یہ اقتباس پڑھنے کے بعد میرا یہ قیاس اور بھی قوی ہو گیا ہے کہ مودودی صاحب نے بچپن میں ضرور مارکس یا لینن کے اُردو ترجمے پڑھے ہیں اور روسی انقلاب کی تاریخ بھی دیکھی ہے۔ جن سے اُن کی طبیعت میں بہت ولولے پیدا ہوئے ہیں اور نئے نئے خیال دل میں آئے ہیں کہ اچھایوں بھی

ہو سکتا ہے؟ گذشتہ مصلحین تو پھر یُونہی بھُولے بھٹکے رہے۔ یہ نہ کسی سے ہوُا کہ ایک انقلابی پارٹی بنا لیتا جس کا نعرہ یہ ہوتا کہ ہم آئے تو اصلاح کرنے ہی ہیں مگر "یہ سمجھنے کے لئے زیادہ غور کرنے کی بھی ضرورت نہیں کہ اصلاحِ خلق کی کوئی اسکیم بھی حکومت کے اختیارات پر قبضہ کئے بغیر نہیں چل سکتی"۔

"لہٰذا اِس پارٹی کے لئے حکومت پر قبضہ کئے بغیر کوئی چارہ نہیں"[1]۔

چنانچہ ہم پہلے حکومت پر قبضہ کریں گے اس کے بعد تمہاری اصلاح کا کام شروع کریں گے اور تم دیکھو گے کہ حکومت آتے ہی ہم مار مار کر تمہارے دلوں کو کیسا صاف اور ستھرا کر دیتے ہیں۔ اس ذکر میں مجھے قرآنِ کریم اور مولانا کے درمیان ایک اور اختلاف یاد آگیا۔ قرآنِ کریم تو فرماتا ہے کہ جب اصلاح کا وقت ختم ہو جاتا ہے تو پھر سختی کا وقت شروع ہوتا ہے۔ اور جب سختی کا وقت شروع ہو جاتا ہے تو پھر اصلاح کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ فرعون اٰمَنْتُ اٰمَنْتُ کہتا ڈوب گیا مگر اُس کا ایمان قبول نہ ہوُا۔ اِسی مضمون کو دوسری جگہ قرآن کریم یُوں بیان فرماتا ہے:۔

فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا

---

[1] حقیقتِ جہاد صـ ۵۹ +

سُنَّتَ اللّٰہِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِہٖ ج وَ

خَسِرَ ھُنَالِكَ الْکٰفِرُوْنَ ۝ (المومنون ۹/۸۵)

لیکن جب وہ ہمارا عذاب دیکھ چکے تو اُن کے ایمان
نے انہیں کچھ بھی فائدہ نہ دیا۔ یہ خدا کی سُنت ہے جو اُسکے
بندوں کے بارہ میں چلی آتی ہے۔ اور یہ وہ مقام ہے جہاں
کافر گھاٹے میں پڑ گئے۔

مودودی نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے اور اس نظریہ کے
مطابق ڈنڈا پہلے ہے اصلاح بعد میں ہے۔ بلکہ حقیقی ایمان تو نصیب ہی
اُس وقت ہوتا ہے جب تلوار دلوں کے زنگ دُور کر دے۔

یہ بحث تو خیر یونہی ضمناً نکل آئی ذکر یہ ہو رہا تھا کہ مودُودی صاحب کے
یہ تصوّرات کہاں سے آئے ہیں۔ قرآنِ کریم سے اگر نہیں تو پھر کہیں سے تو
آئے ہیں یا محض اپنی ہی ایجاد ہے؟ مشکل یہ ہے کہ ایجاد اسے ہم کہہ نہیں
سکتے کیونکہ اِس قسم کے اصلاحی تصوّرات پہلے ہی سے دنیا میں موجود ہیں۔
دیکھنا صرف یہ باقی تھا کہ کہاں موجود ہیں۔ چنانچہ اِس ضمن میں جو کچھ
مجھے معلوم تھا وہ تحریر کر دیا۔

اب آخر پر میں اُس ردِّ عمل کو لیتا ہوں جو مولانا کے مندرجہ بالا مجوّزہ
انقلابی اعلان کو پڑھ کر مختلف طبائع پر ہو سکتا ہے۔ ایک تاثر تو وہی ہے

جس کا میں نے اوپر ذکر کر دیا ہے یعنی انسان اسے زیادہ سے زیادہ ایک "عمر بزرگ کا بچپن" سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ میں سوچتا ہوں کہ بفرضِ محال اگر واقعی کوئی ایسا انقلابی دن کسی بدقسمت ملک نے دیکھا تو اس اعلان کو پڑھنے کے بعد لوگوں کا ردِ عمل کیا ہو گا۔

میرا خیال ہے موٹی طبیعت کے اُجڈ قسم کے آدمی تو یہ اعلان پڑھ کر قاصد کے منہ پہ ماریں گے کہ "جاؤ جاؤ بڑے آئے ہو اصلاح کرنے کرنے والے کہیں کے۔ خدائی فوجدار بنے پھرتے ہو۔ تمہیں کس نے ٹھیکہ دیا ہے میرے مذہب کا؟ گھر جا کر بیٹھو۔ اور اگر پھر اس طرف کا رُخ کیا تو......" یہ وہی طبقہ ہے جس کے متعلق غالب کہتا ہے کہ ؎

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرف اِن بے ادبوں کے

یہ طبقہ میں سمجھتا ہوں کہ مزید مہلت دیئے بغیر اُسی وقت حکومت کے رجسٹروں میں "کافر" شمار کر لیا جائے گا۔

دوسرا ایک بڑا طبقہ میرے خیال میں ایسا ہو گا جو ایک سال سخت پریشانی کے عالم میں مبتلا رہنے کے بعد جز بز تو بہت ہو گا مگر آخر "غیر مسلم" ہونے کا اعلان کر دے گا۔ یہ مؤخر الذکر طبقہ وہ ہے کہ جس کا پہلا ردِ عمل عام طور پر جان بچانے کے خیال کی صورت میں ظاہر ہوا کرتا ہے۔ یہ وہی

طبقہ ہے جس کے متعلق مودودی صاحب کو یہ خوف ہے کہ اگر فوری طور پر مرتد کی سزا قتل قرار دے دی گئی تو یہ فوراً منافق مسلمان بن جائے گا۔

اب رہا میرا ذاتی ردِ عمل تو مَیں ابھی سے کھول کر بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر تو اِس اعلان میں "غیر مسلم" کے الفاظ سے آپ کی مراد یہ ہے کہ کوئی مسلمان آپ کے مخصوص عقائد کو ماننے سے انکار کر دے اور آپ کے استبداد کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ ہو۔ اگر کفر سے یہ مراد ہے کہ کوئی محبّت کرنے والا اپنے محبوب آقا کی طرف پھینکے جانے والے اس مکروہ الزام کو ٹھوکریں مارے کہ آپؐ نے معجزات اور قوّتِ قدسیہ کی "ناکامی" کے بعد تلوار کے زور سے اسلام کو پھیلایا تھا تو پھر مجھے آج ہی "زمرۂ کفّار" میں لکھ لیجئے۔ اور بخدا اگر اِس کُفر کی سزا سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جانے کی بجائے سُولی پر لٹکایا جانا بھی ہو اور ایک ملک کا اقتدار ہی نہیں رُوئے زمین کی ساری طاقتیں بھی آپ کی مُٹھی میں جمع ہو جائیں اور ہولناک مظالم کے بُھتنے آپ کی انگلیوں اور پلکوں کے اشاروں پر ناچنے لگیں تو بھی میرا جواب یہی ہو گا کہ :۔

بعد از خدا بعشقِ محمدؐ مخمّرم
گر کُفر ایں بود بخدا سخت کافرم

در کوئے تو اگر سرِ عُشّاق را زنند

اوّل کسے کہ لافِ تعشّق زَنَد مَنَم

خدا تعالیٰ کے بعد میں محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے عشق میں مخمور ہوں۔ اگر کفر یہی ہے تو خدا کی قسم میں سخت کافر ہوں!

ہاں، اے میرے پیارے رسول ؐ، اگر تیرے کوچہ میں عُشّاق کا سر قلم کرنے کا ہی دستور جاری ہو تو وہ پہلا شخص جو نعرہ عشق بلند کرے گا میں ہوں گا۔ میں ہوں گا!

احرارِ علماء میدانِ عمل میں

ایک واقعاتی جھلک

مولانا مودودی کے اقتدار کا خواب تو کبھی شرمندۂ تعبیر
نہ ہو سکے گا مگر اُن کے نظریات کی تشہیر نے اور اُن کے ہمنوا بعض
اُور علماء کی آتش نوائیوں نے آج سے چند سال پہلے پاکستان
کو اس خواب کی تعبیر کی
ایک جھلک دکھائی تھی

فسادات کا مقصد اور طریقِ کار

بد قسمتی سے اِس زمانہ کے بعض اور علماء کے دلوں میں بھی ایسی سختی آ چکی ہے
کہ وہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار رحمت اور شفقت، ہمدردی اور خلوص کے اِن
جذبات سے بالکل عاری ہو چکے ہیں جو ہر سچے مذہب کی روحِ رواں ہُوا کرتے
ہیں۔ یہاں نام بنام ایسے تمام علماء کے مذہبی تصورات کی تفاصیل میں جانے
کا موقع نہیں۔ اور اِس بنا پر کہ مولانا مودودی کو اِس گروہ میں ایک نمایاں
حیثیت حاصل ہے اور متشدد عقائد میں کوئی دوسرا اُن کا لگا نہیں کھاتا محض
مولانا کے تصورات کا ہی کسی قدر تذکرہ کر دیا گیا ہے۔ یہ علماء جب اِن ذاتی
نظریات کو اسلام کی طرف منسوب کر کے لاعلم عوام میں پھیلاتے ہیں تو ہر طرف
فتنہ و فساد اور شر انگیزی کا ایک طوفانِ عظیم برپا ہو جاتا ہے اور وہ تمام کہانیاں

دوہرائی جانے لگتی ہیں جن کا ابتدائے مضمون میں ذکر کیا گیا تھا۔ اب تک میں ان علماء کے مذہبی تصوّرات سے ناظرین کو آگاہ کر رہا تھا اب میں عملی دنیا پر ان کا اطلاق ہوتا ہؤا دکھاتا ہوں۔

۱۹۵۳ء کا سال پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ ایک تاریک ترین سال کے طور پر لکھا جائے گا اور یہ وہی سال ہے جب کہ بعض دینی علماء کو اپنے دینی افکار کو عملی جامہ پہنانے کا خوب دل کھول کر موقع ملا تھا۔ ان کا اسلامی تصوّر جو پہلے اُن کے سینوں کی کوٹھڑیوں میں مقیّد تھا اور ملکی قوانین کی زنجیروں میں پابند رہا کرتا تھا ان سب قیدوں سے آزاد ہو کر اُس سال اپنے خدوخال کو خوب نکھار کر منظرِ عام پر آگیا اور پنجاب کے طول وعرض میں قریہ قریہ پھرنے لگا۔ ابتداءً چھپ چھپ کر، دن کی روشنی سے گھبراتا ہؤا، قانون کی زد سے بدن چراتا ہؤا۔ پھر رفتہ رفتہ کھُلتے کھُلتے بے باک ہو گیا اور پنجاب کے گلی کوچوں میں آزادانہ پھرنے لگا۔ یہاں تک کہ ۶؍مارچ ۱۹۵۳ء کا وہ دن آیا جبکہ اُس کی آزادی ہر قید و بند کی حدیں توڑ چکی تھی۔ یہ وہی دن تھا جس کے متعلق بعد میں تحقیقاتی عدالت کے فاضل ججوں نے یہ رائے قائم کی کہ:- "اس دن کے واقعات کو دیکھ کر سینٹ بارتھولومیوڈے یاد آتا تھا"[1]

---

[1] "تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ" ص۱۵۱ +

"سینٹ بارتھولومیو ڈے" فرانس کی تاریخ کا وہ دن ہے کہ جس کے ذکر سے آج بھی فرانسیسی شرما جاتے ہیں۔ یہ وہ دن ہے جسے رات کہنا بہتر ہو گا۔ کیونکہ اُس رات مُلک کے رومن کیتھولک مذہبی راہنماؤں اور بادشاہِ وقت کی باہمی سازش سے پروٹسٹنٹ فرقہ سے تعلق رکھنے والے کمزور اور بے کس عیسائیوں کا ایک سفاکانہ قتلِ عام کیا گیا اور اِس بے دردی سے اُن کو مارا گیا کہ اہلِ فرانس ہی نہیں انسان بحیثیتِ مجموعی اُس کے ذکر سے شرمانے لگتا ہے۔

اس دن کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر ولیم ہاوٹ اپنی کتاب "ہسٹری آف پریسٹ کرافٹ ان اول ایجز" میں لکھتے ہیں:-

"قاتلوں کے شور، مظلوموں کی آہ و فغاں اور زخمیوں کی چیخ و پکار سے قیامت برپا تھی۔ مقتولوں کے جسم کھڑکیوں سے باہر پھینکے اور بازاروں میں سڑکوں پر گھسیٹے گئے اور اس سلسلہ میں بچوں اور بوڑھوں، مردوں اور عورتوں میں کوئی امتیاز روا نہ رکھا گیا۔ ان کے ناک کان وغیرہ کاٹے گئے اور یہ سب کچھ خدا کی عزت و عظمت کو قائم کرنے کے لیے کیا گیا۔"

چنانچہ فاضل ججوں کی رائے میں ۶ مارچ ۱۹۵۳ء کا دن پاکستان کی تاریخ میں سینٹ بارتھولومیو ڈے کی حیثیت رکھتا تھا۔ کیونکہ:-

"انسانوں کے بڑے بڑے مجمعوں نے جو معمولی حالات میں معقول اور سنجیدہ شہریوں پر مشتمل تھے ایسے سرکش اور جنون زدہ ہجوموں کی شکل اختیار کر لی تھی جن کا واحد جذبہ یہ تھا کہ قانون کی نافرمانی کریں اور حکومتِ وقت کو جھکنے پر مجبور کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی معاشرے کے ادنیٰ اور ذلیل عناصر موجودہ بدنظمی اور ابتری سے فائدہ اٹھا کر جنگل کے درندوں کی طرح لوگوں کو قتل کر رہے تھے۔ ان کی املاک کو لوٹ رہے تھے اور قیمتی جائداد کو نذرِ آتش کر رہے تھے محض اس لئے کہ یہ ایک دلچسپ تماشہ تھا۔ (کیا اسی قسم کا تماشہ جیسے رومن امراء کالسیم میں بیٹھ کر دیکھا کرتے تھے؟ ناقل) یا کسی خیالی دشمن سے بدلہ لیا جا رہا تھا۔ پوری مشینری جو معاشرہ کو زندہ رکھتی ہے پرزہ پرزہ ہو چکی تھی"[۱]

ایک مسلمان کے دل میں ان دن کے ہولناک واقعات پر نظر ڈالتے ہی معاً یہ خیال پیدا ہو گا کہ جب اسلام بلاشبہ امن اور محبت کی تعلیم دیتا ہے تو پھر ایسا کیوں ہوا اور کیوں مذہبی راہنماؤں کے ایک

---

[۱] "تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ" صفحہ ۱۹۳۔

مخصوص گروہ نے یہ قابل شرم حالات پیدا کر دیئے ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ قرآن کریم کی پیش کردہ مذہبی تاریخ سے ثابت کیا جا چکا ہے اس قسم کے قبیح افعال کبھی بھی مذہب کی خاطر نہیں کئے جاتے بلکہ مذہب کے نام پر کئے جاتے ہیں ۔ مذہب تو ایک قربانی کا بکرا ہوا کرتا ہے جو بدنامی کے داغ تھوپنے کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ پس پردہ مقاصد ہمیشہ کبھی تو اقتدار کی ہوس اور کبھی لیڈری کی خواہش ، کبھی نام و نمود اور کبھی بغض اور حسد ہوتے ہیں ۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء کے فسادات کی چھان بین کے بعد تحقیقاتی عدالت کے فاضل جج بھی اسی قطعی نتیجہ تک پہنچے کہ احرار علماء نے مذہب کے نام پر جو غیر مذہبی افعال کئے اُن کی اغراض بھی کچھ اور تھیں ۔ چنانچہ اسی ذکر میں وہ لکھتے ہیں :۔

"احرار کے رویّہ کے متعلق ہم نرم الفاظ استعمال کرنے سے قاصر ہیں ۔ ان کا طرزِ عمل بطور خاص مکروہ اور قابلِ نفرین تھا ۔ اس لئے کہ انہوں نے ایک دنیاوی مقصد کے لئے ایک مذہبی مسئلہ کو استعمال کر کے اس مسئلہ کی توہین کی ۔"

"ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کریں اور پاکستان کے استحکام کے متعلق

عوام کے اعتماد کو نقصان پہنچائیں۔ اس شورش کا مقصد واضح ہے کہ مذہب کا لبادہ اوڑھ کر فرقہ وار اختلاف کی آگ کو بھڑکایا جائے اور مسلمانوں کے اتحاد کو تباہ کر دیا جائے[۱]۔"

پس پاکستان کے دو منصف مزاج فاضل ترین ججوں کے فیصلہ کے مطابق جس تک وہ نہایت غور و خوض اور چھان بین کے بعد پہنچے:۔

"اسلام اُن کے لئے ایک حربہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جسے وہ کسی سیاسی مخالف کو پریشان کرنے کے لئے جب چاہتے بالائے طاق رکھ دیتے اور جب چاہتے اٹھا لیتے۔ کانگریس کے ساتھ سابقہ پڑنے کی صورت میں تو انکے نزدیک مذہب ایک نجی معاملہ تھا اور وہ نظریۂ قومیت کے پابند تھے لیکن جب وہ لیگ کے خلاف صف آرا ہوئے تو ان کی واحد مصلحت اسلام تھی جس کا اجارہ انہیں خدا کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ ان کے نزدیک لیگ اسلام

---

[۱] رپورٹ تحقیقاتی عدالت صفحہ ۱۱۶

سے بے پرواہ ہی نہ تھی بلکہ دشمنِ اسلام بھی تھی۔ ان کے نزدیک قائداعظم ایک کافر اعظم تھے۔“[1]

پھر فرماتے ہیں:۔

”یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اب احراریوں نے احمدیوں کے خلاف نزاع کو اپنے اسلحہ خانہ سے ایک سیاسی حربے کے طور پر باہر نکالا اور جو واقعات اس کے بعد پیش آئے وہ اس امر کی بیّن شہادت ہیں کہ وہ سیاسی جماعت کی حیثیت سے نہایت فہیم و چالاک ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ اگر عوام کے جذبات کو احمدیوں کے خلاف برانگیختہ کر دیں گے تو کوئی ان کی مخالفت کی جرأت نہیں کرے گا اور اُن کی اس سرگرمی کی جتنی بھی مخالفت کی جائیگی اسی قدر وہ ہردلعزیز اور مقبول عام ہو جائیں گے اور بعد کے واقعات سے یہ ثابت ہو گیا کہ اُن کا یہ مفروضہ بالکل صحیح تھا۔“[2]

پس بلا شبہ یہ ثابت ہے کہ ازمنۂ گزشتہ کی طرح ۱۹۵۳ء

---

[1] رپورٹ تحقیقاتی عدالت ص۲۷۴ ۔ [2] رپورٹ تحقیقاتی عدالت ص۲۷۶ ۔

میں بھی جو فساد برپا کیا گیا وہ مذہب کے نام پر تو ضرور تھا مگر مذہب کی خاطر نہ تھا اور حضرت محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پاک دین اس سے کلیتہً بری الذمہ ہے۔

یہاں یہ اہم سوال اُٹھتا ہے کہ آخر یہ مخصوص راہنما کس طرح ایک قلیل التعداد فرقہ کے خلاف اس قدر خوفناک آتشِ غیظ و غضب بھڑکانے میں کامیاب ہو گئے کہ فاضل ججوں کو اُس پر ایک نظر ڈالنے سے سینٹ بارتھولومیو ڈے کی یاد آگئی تو اس اہم سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ بعینہٖ اسی طرح ہوا جس طرح ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے اور تاریخ مذاہب کا ہر خونی باب جس میں مذہب کے نام پر خون کی ہولی کھیلنے والوں کے طریقِ کار کا تذکرہ موجود ہے، اس موضوع پر بڑی وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتا ہے۔ اس طریقِ کار کی ایک جھلک تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ میں بھی نظر آجاتی ہے۔ فاضل جج اسی طریقِ کار کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"احمدیوں کے خلاف معاندانہ اور بے بنیاد الزام لگائے گئے ہیں کہ باونڈری کمیشن کے فیصلہ میں ضلع گورداسپور اس لئے ہندوستان میں شامل کر دیا گیا کہ احمدیوں نے ایک خاص رویّہ اختیار کیا اور چوہدری ظفر اللہ خان نے جنہیں قائدِ اعظم نے اس کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کا کیس پیش

کرنے پر مامور کیا تھا خاص قسم کے دلائل پیش کیے لیکن عدالت ہذا کا صدر (سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان اور حال وزیرِ قانون مرکزیہ مملکتِ پاکستان) جو اس کمیشن کا ممبر تھا اس بہادرانہ جدوجہد پر تشکر و امتنان کا اظہار کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے جو چوہدری ظفر اللہ خاں نے گورداسپور کے معاملہ میں کی تھی۔ یہ حقیقت باونڈری کمیشن کے کاغذات میں ظاہر و باہر ہے اور جس شخص کو اس مسئلہ سے دلچسپی ہو وہ شوق سے اس ریکارڈ کا معائنہ کر سکتا ہے۔ چوہدری ظفر اللہ خاں نے مسلمانوں کی نہایت بے غرضانہ خدمات سرانجام دیں ان کے باوجود بعض جماعتوں نے عدالتِ تحقیقات میں ان کا ذکر جس انداز میں کیا ہے وہ شرمناک ناشکرے پن کا بیّن ثبوت ہے[1]۔"

اُن علماء کی طرف سے احمدیت پر بس یہی ایک "بے بنیاد الزام" نہیں لگایا گیا بلکہ جھوٹے پراپیگنڈے کا ایک طوفانِ بے تمیزی بپا کر دیا گیا اور ہر حادثہ اور ہر سازش کو جماعت احمدیہ پر تھونپا جانے لگا۔

---

[1] "تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ" صفحہ ۲۰۹۔

جنگ شاہی کے دردناک حادثہ کی ذمہ داری بھی احمدیوں پر ڈالی گئی اور راولپنڈی کی سازش بھی احمدیوں کی طرف ہی منسوب کی گئی! خان لیاقت علی خان کے ناپاک قتل کا الزام بھی مظلوم احمدیوں کے سر ہی دھرا گیا اور کبھی انہیں ہندوستان کا جاسوس کہا گیا اور کبھی ان پر گندے اخلاقی الزام لگائے گئے اور کبھی پاکستان کا غدار بتایا گیا اور افترا اور ظلم کی کوئی حد نہ رہنے دی گئی۔ یہاں تک کہ احمدیوں پر یہ طومار بھی باندھا گیا کہ ہم نعوذ باللہ اپنے محبوب ترین نبی، اپنے مقدس آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی توہین کرتے ہیں اور آپؐ کو گالیاں دیتے ہیں۔ مگر منصف جج صاحبان نے جب الزامات کی گہری چھان بین کی تو صورتِ حال کو بالکل برعکس پایا۔ چنانچہ جنگ شاہی کے حادثہ کے متعلق وہ مسٹر انور علی ڈی۔ آئی۔ جی سی آئی ڈی کا یہ تبصرہ نقل فرماتے ہیں کہ:-

"یہ بیان بالکل جھوٹ ہے کہ جنگ شاہی یا لاہور چھاؤنی کے ہوائی حادثوں میں مرزائیوں کا ہاتھ تھا کیونکہ جنگ شاہی کے حادثہ میں جو اشخاص ہلاک ہوئے اُن میں جنرل شیر خان تھے جو خود مرزائی تھے۔ احرار کی تقریریں صرف زہریلی ہی نہیں بلکہ ناشائستہ اور مکروہ ہیں"[1]

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صـ۱۲۱

سازش راولپنڈی کے متعلق فاضل ججوں نے لکھا :-

"مولوی محمد علی جالندھری نے ۱۵ اپریل ۱۹۵۱ء کو منٹگمری کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ان کے پاس اس امر کی تحریری شہادت موجود ہے کہ سازش راولپنڈی سے احمدیوں کا تعلق موجود ہے' یہ بلاشبہ مہمل بات تھی"۔

پھر فرماتے ہیں :-

"یہ واضح طور پر نفرت کی تلقین تھی اور نفرت بھی نہایت مکروہ قسم کی۔ کیونکہ نہ تو مولوی محمد علی ایسے اہم تھے کہ ایسی شہادت اُن کے قبضہ میں ہوتی اور نہ کوئی تحریر اس کے بعد مقدمہ سازش کے ٹربیونل کے سامنے پیش کی گئی لیکن اس قسم کی شبہ انگیز خبر نہایت آسانی سے لوگوں کے دماغوں میں گھر کر لیتی ہے"[۱]

پھر خان لیاقت علی خان کے قتل کا الزام احمدیوں پر دھرتے ہوئے :-

"قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے یہ کہہ دیا کہ قائدِ ملت کے قتل میں (جو گزشتہ اکتوبر میں ہوا تھا) احمدیوں

---

[۱] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۲۲۹ +

کا ہاتھ تھا[1]۔"

مگر اس الزام کا بودا پن ایسا ظاہر و باہر تھا کہ فاضل ججوں نے اس پر محض یہ طنزیہ فقرہ چست کرنا ہی کافی سمجھا کہ :-

"ان لوگوں کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ یہ تمام قومی مصائب کی تحقیقات کے گمشدہ سلسلے دریافت کرنے میں ید طولےٰ رکھتے ہیں[2]۔"

پھر مظفر گڑھ کی ایک تقریر میں ایک نہایت مشہور احراری لیڈر نے جو اب اس جہان سے کوچ کر چکے ہیں احمدیوں پر بہتان باندھا کہ :-

"ایک احمدی جاسوس ایک شخص گوپال داس کی معیت میں گرفتار کیا گیا ہے اور میں نے حکومت کو اس سلسلہ میں عمدہ معلومات مہیا کی ہیں۔"

اس الزام کو اپنی رپورٹ میں درج فرما کر فاضل جج تحریر فرماتے ہیں :-

"کیا عام سیدھے سادے لوگ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ بزرگ جو ابھی کہن سالی کے بوجھ سے زیر بار ہونے کے باوجود شمشیر کی طرح تیز ہے۔ گوپال داس کے ساتھی کے متعلق

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۲۱۰ ۔ [2] رپورٹ صفحہ ۲۳۵ ۔

ایسی کہانی تصنیف کرے گا جس کو سچائی سے کوئی دُور کا واسطہ بھی نہیں؟ اگر یہ سچ ہو تو کیا اس سے "غداروں" کے خلاف شدید جذبات مشتعل نہ ہو جائیں گے؟ اگر آپ یہ جانتے ہوئے کہ اِس تقریر کی بنا جھوٹ پر ہے اس کو نظر انداز کر رہے ہیں تو یہ مقرر کے سفید بالوں کا احترام تو شاید ہو لیکن آپ اُس مرض سے تغافل کر رہے ہیں جو اس نے آپ کی قوم میں پھیلا دیا ہے[1]۔"

چنانچہ بڑے بڑے سفید ریش احرار علماء سٹیجوں پر چڑھ کر جھوٹ پر جھوٹ بولنے لگے اور الزام پر الزام تراشنے لگے اور:۔

"جتنا وقت گزرتا گیا تقریروں کا لہجہ بد سے بد تر ہوتا چلا گیا... احرار نے اپنی پوری توجہ احمدیوں کی بدگوئی پر مرتکز کر دی اور نہایت شرمناک دشنام طرازی کا آغاز کر دیا[2]۔"

احرار کی جن تقاریر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسٹر انور علی نے "نہایت شرمناک دشنام طرازی" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں اُن کا پورا تعارف اس مختصر تعریف میں نہیں ہو سکتا بلکہ حقیقۃً وہ ایسی انسانیت سوز

---

[1] رپورٹ صفحہ ۳۳ ۔ [2] رپورٹ صفحہ ۲۶ بحوالہ مسٹر انور علی ڈی ۔ آئی ۔ جی ۔ سی ۔ آئی ۔ ڈی ؛

ہیں کہ ایک عام انسان کے متعلق بھی اگر وہ الفاظ استعمال کئے جائیں جو مقدس بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ کے متعلق کئے گئے تو کوئی شریف انسان انہیں سننے کی تاب نہیں لا سکتا۔ اور تمام احرار لیڈر بشمولیت مولوی محمد علی جالندھری و ماسٹر تاج الدین انصاری و ابوذر بخاری اس دشنام طرازی اور بدکلامی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے لگے اور تعجب ہے کہ پھر بھی اُسی نبیوں کے سردار کی جانشینی کا دعویٰ کرتے تھے جس کی زبان الہام کی طرح پاک اور صاف اور شیریں تھی اور جس کی تعلیم یہ تھی کہ :-

"وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ"

(خبردار) اُن معبودانِ باطلہ کو (بھی) گالیاں نہ دو جنہیں یہ لوگ خدا کے سوا شریک ٹھہراتے ہیں۔ مبادا یہ اپنی جہالت سے خدا کو برا بھلا نہ کہنے لگ جائیں۔"

مگر یہاں تو کوئی معبود باطل بھی مقابل پر نہیں تھا بلکہ اسلام کا ایک ایسا فدائی تھا جس نے اپنی ساری زندگی خدمتِ اسلام میں صرف کردی اور جس کا "قصور" صرف اتنا تھا کہ اُس نے خدا کے فرمان کے مطابق مہدی اور مسیح ہونے کا دعویٰ کیا اور جس کا فخر صرف یہ تھا کہ وہ احمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہے۔ ہاں یہ ننگِ انسانیت شرمناک دشنام طرازی اسی غرض سے

قادیان سے متعلق کی گئی جس کی جان عشقِ محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم میں گداز رہا کرتی تھی۔ اور جو کبھی تو سوزِ محبت سے بے قرار ہو کر اپنے محبوب آقا سے یوں گویا ہوتا تھا کہ:۔

در کوئے تو اگر سرِ عشّاق را زنند
اوّل کسے کہ لافِ تعشّق زند منم

اے میرے آقا! اگر تیرے کوچہ میں تیرے عشّاق کے سر قلم کئے جاتے ہوں تو دعویدارانِ محبّت میں سے سب سے پہلی آواز میری اُٹھے گی کہ "ہاں میں عاشق ہوں۔ مَیں عاشق ہوں"۔

اور کبھی دردِ فراق سے بے تاب ہو کر اپنی قلبی کیفیات کا اظہار یوں کرتا تھا کہ:۔

اُنْظُرْ اِلَیَّ بِرَحْمَۃٍ وَّ تَحَنُّنٍ
یَا سَیِّدِیْ اَنَا اَحْقَرُ الْغِلْمَانٖ
یَا حِبِّ اِنَّکَ قَدْ دَخَلْتَ مَحَبَّۃً
فِیْ مُھْجَتِیْ وَ مَدَارِکِیْ وَ جَنَانٖ
مِنْ ذِکْرِ وَجْھِکَ یَا حَدِیْقَۃَ بَھْجَتِیْ
لَمْ اَخْلُ فِیْ لَحْظٍ وَّلَا فِیْ اٰنٖ

جِسْمِی یَطِیْرُ اِلَیْکَ مِنْ شَوْقٍ عَلَا
یَا لَیْتَ کَانَتْ قُوَّۃُ الطَّیَرَانِ

"(میرے پیارے) میری طرف ایک رحمت اور شفقت کی نظر ڈال۔ دیکھ میرے آقا میں تو ایک ادنے غلام ہوں۔

اے میرے محبوب! تُو اپنی محبت کے ہمرکاب میری رُوح اور میرے دل و دماغ میں سرایت کر گیا ہے۔

اے میری مسرتوں کے باغ! میں تیری یاد سے کسی آن اور کسی لحظہ بھی خالی نہیں رہتا۔

گویا میرا جسم ایک شوقِ غالب کے ساتھ تیری سمت اُڑا چلا جارہا ہے۔ اے کاش اُڑنے کی طاقت ہوتی!۔ اے کاش اُڑنے کی طاقت ہوتی!!"

اِسی خاتم النبییّنؐ کے فدائی اور آپ کے متّبعین کے متعلق احرار راہنماؤں نے فحش کلامی کو اپنی انتہا تک پہنچا دیا اور ہر وہ گندی گالی جو پنجاب کی گلیوں میں سُنائی دی جاسکتی ہے آپ کو دی جانے لگی یہاں تک کہ فاضل ججوں نے جب ان کے بعض اقتباسات احرار اخبارات اور پولیس رپورٹوں میں ملاحظہ کئے تو ایک خاص تحریر کا حوالہ دیتے ہوئے وہ یہ لکھنے

پر مجبور ہو گئے کہ :-

"ایک اُردو اخبار "مزدور" ملتان سے شائع ہوتا ہے جس کا ایڈیٹر سیّد ابوذر بخاری ہے جو مشہور احراری لیڈر سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کا بیٹا ہے۔ اُس نے اپنی اشاعت ۱۳ر جون ۱۹۵۲ء میں ایک مضمون شائع کیا جس میں جماعت احمدیہ کے امام کے متعلق عربی خط میں ایک ایسی پست اور بازاری بات لکھی کہ ہماری شائستگی ہمیں اس کی تصریح کی اجازت نہیں دیتی۔ اگر یہ الفاظ احمدی جماعت کے کسی فرد کے سامنے کہے جاتے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ کسی کی کھوپڑی توڑ دی جاتی تو ہمیں اس پر ذرا بھی تعجّب نہ ہوتا۔ جو الفاظ استعمال کئے گئے وہ پرلے درجے کے مکروہ اور مبتذل ذوق کا ثبوت ہیں اور اُن میں اُس مقدّس زبان کی نہایت گستاخانہ تضحیک کی گئی ہے جو قرآن مجید اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے۔"

ل تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۸

پس یہی وہ طریق کار ہے جس کے ذریعہ ان راہنماؤں نے مغربی پاکستان کے طول و عرض میں احمدیوں کے خلاف مخالفت کی ایک آگ بھڑکا دی اور خود جلتے ہوؤں کا تماشا کرنے کے لئے کنارے بیٹھ رہے اور جیسا کہ دُنیا کا دستور ہے مسلمان شرفاء کی اکثریت اگرچہ سخت نفرت اور ناپسندیدگی کے ساتھ اِس "خدمتِ اسلام" کو دیکھتی رہی مگر سخت مجبور و لاچار تھی کیونکہ یہ شرفاء جانتے تھے کہ یہ "علماء" ایک لمبے عرصہ کی کُھلی بدزبانی کے زور سے (جسے یہ "زورِ خطابت" کا نام دیتے تھے۔) عامی جذبات میں سخت ہیجان پیدا کر چکے ہیں اور آج ہر وہ شخص جو اِس ظلم و استبداد کے خلاف آواز بلند کرے گا خود بھی اسی ظلم و ستم کا نشانہ بن جائے گا۔ یہ کوئی فرضی خوف نہیں تھا بلکہ عملاً ایسا ہوتا بھی رہا۔ چنانچہ ایک موقع پر جبکہ ایک غیر احمدی منصف مزاج پولیس افسر نے ایک ہنگامہ آرائی کو روکنے کی کوشش کی تو اُس کے خلاف بھی افتراء پردازی اور اشتعال انگیزی کا ایک ہنگامہ گرم کر دیا گیا اور پولیس کے خلاف یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ:۔

"پولیس نے رضاکاروں کو منتشر کرتے ہوئے قرآن مجید کی توہین کی۔ اُس کو ٹھوکریں لگائیں۔ اُس کے اوراق پھاڑ دیئے اور ایک چھوٹے سے لڑکے کو ہلاک کر دیا۔ دہلی دروازہ

کے باہر جلسہ ہوا جس میں ایک لڑکا پیش کیا گیا جو اپنے ہاتھوں میں قرآن مجید کے چند پھٹے ہوئے اوراق لئے ہوئے تھا۔ اُس نے بیان کیا کہ میں کلامِ الٰہی کی اس توہین کا عینی گواہ ہوں۔ ایک مولوی نے دغالباً مولوی محمد یوسف صاحب) یہ اوراق ہاتھ میں لیکر حاضرین کو دکھائے اور ایک نہایت پُرتشدّد تقریر کی۔ جس سے غصّہ سے بھرا ہوا مجمع اَور بھی زیادہ غضبناک ہو گیا۔ واقعہ کی یہ بناوٹی کہانی ہر جگہ جوش میں بھرے ہوئے لوگوں کا موضوعِ گفتگو بن گئی اور چند ہی گھنٹوں کے اندر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی جس سے پولیس کے خلاف غیظ و نفرت کے جذبات برانگیختہ ہو گئے۔"[1]

اور صرف جذبات ہی برانگیختہ نہیں ہوئے بلکہ تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ کے مطابق:۔

"اسی غلط افواہ سے اشتعال کے نتیجہ میں سیّد فردوس شاہ ڈی۔ ایس۔ پی کی وفات کا حادثہ ہوا۔ اُن پر چھروں اور لاٹھیوں سے حملہ کر کے وہیں ہلاک کیا گیا۔ سیّد فردوس شاہ کے جسم پر ۵۲ زخموں کے نشان تھے۔"[2]

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۱۵۸۔ [2] رپورٹ صفحہ ۱۶۱۔

یہ تھا اُن مذہبی راہنماؤں کا طریقِ کار جو خدا تعالیٰ کے سب سے سچے بندے اور راستبازوں کے سردار حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے لے کر اور آپ کے قرآن کو ہاتھوں میں تھامے ہوئے دنیا میں جھوٹ کی اشاعت کر رہے تھے اور صرف احمدی ہی اُن کی مشقِ ستم کا نشانہ نہیں بنے بلکہ ہر وہ شریف النفس اور جرأت مند پاکستانی بھی ان کی افترا پردازی کا شکار ہونے لگا جس نے ان کی اس بے راہ روی کے خلاف آواز اُٹھائی۔ اور ہر وہ پولیس کا سپاہی جو ان کی راہ میں حائل ہونے لگا ان کی اینٹوں کا نشانہ بن گیا۔ اور یہ صورتِ حال اتنی شدید ہو گئی کہ شرفاء میں اس کے خلاف آواز اٹھانے تک کی سکت باقی نہ رہی۔ چنانچہ فاضل جج اپنی رپورٹ میں گوجرانوالہ کی صورتِ حال کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

"جب ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ٹرین کو روانہ کر دینے کی دوسری کوشش کی تو اُن پر حملہ کر دیا گیا۔ جس سے دو چار اور پولیس مین زخمی ہو گئے۔ جن میں ایک انسپکٹر بھی تھا۔ اسی دن شام کو پانچ ہزار کے ایک جوش میں بھرے ہوئے ہجوم نے ریلوے سٹیشن سے کچھ فاصلہ پر سندھ ایکسپریس کو روک لیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس چھ پیادہ کانسٹیبلوں کو

ساتھ لے کر اس مقام پر پہنچے مگر اُن پر اینٹوں اور پتھروں کی بوچھاڑ کی گئی۔ چونکہ اُس وقت اندھیرا ہو چکا تھا اور اگر ہجوم منتشر نہ ہوتا تو تشدد پر اُتر آتا اور ٹرین کے مسافروں کی پریشانی کا باعث ہوتا۔ اس لئے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے تین پیادہ کانسٹیبلوں کو حکم دیا کہ بارہ راؤنڈ ہوا میں چلائیں۔ اس سے ہجوم منتشر ہو گیا اور کسی قسم کا جانی نقصان نہ ہُوا۔ اور اس کے بعد معززینِ شہر کا ایک اجلاس ریلوے سٹیشن پر طلب کیا گیا۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک اس غنڈے پن کی مذمت کر رہا تھا لیکن کسی قسم کی عملی امداد کرنے پر آمادہ نہ تھا کہ مبادا وہ کافر یا مرزائی قرار دیا جائے۔"[1]

یہ خوف کوئی فرضی خوف نہیں تھا اور عملی امداد کرنے کی سزا بڑی سنگین تھی۔ چنانچہ تحقیقاتی عدالت کے جج اسی قسم کے ایک جرأت مندانہ اظہارِ شرافت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اُسی شام کو ایک غیر احمدی عبدالحی قریشی کو جس نے ہجوم کو تشدد سے منع کیا تھا زدوکوب کیا گیا اور اُس کا

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صہ ۱۸۲

گھر لوٹ لیا گیا!![1]"

یہی وجہ تھی کہ بعض ایسے غیر جانبدار اخبارات بھی جو اس غیر اسلامی ہنگامہ کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اس کے خلاف جرأت مندانہ اظہارِ رائے سے گریز کرتے رہے۔ چنانچہ جب صورتِ حال کو قابو سے نکلتے دیکھ کر حکومت نے آخر کچھ مضبوط اقدام کرنے کا فیصلہ کیا اور ہوم سیکرٹری نے بعض اخبارات کے ایڈیٹروں کو بلوا کر انہیں اس امر پہ آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ نفاذِ قانون کے سلسلہ میں حکومت کی کوششوں کی تائید کریں تو مسٹر حمید نظامی نے جو اس وقت نوائے وقت کے ایڈیٹر تھے "یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر وہ اپنے اخبار میں اس خیال کا اظہار کریں گے تو حکومت اور مسلم لیگ کے منظورِ نظر اخبارات اپنی اشاعت بڑھانے کے لئے سب سے پہلے انہیں احمدی قرار دے کر نشانۂ ملامت بنائیں گے۔"[2]

بس یہی وہ خوف تھا جس نے پاکستان کے طول و عرض میں شرفاء کی آواز کا گلا گھونٹ رکھا تھا اور جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ خوف غالب آتا چلا گیا اور احتجاج کی آواز دبتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا کہ صوبہ سرحد کے سوا تقریباً تمام مغربی پاکستان احرار کے چنگل

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۱۷۷ ۔ [2] رپورٹ صفحہ ۲۸۳

میں آگیا اور "خدمتِ اسلام" کے حیرت انگیز کارنامے دنیا کو دکھائے جانے لگے۔ صوبہ سرحد ان کی زد سے محض اس لئے بچا کہ اُس صوبہ کی حکومت ایک مضبوط حکومت تھی اور قانون کے آہنی شکنجہ کی پکڑ بہت سخت تھی اور مشرقی بنگال اس سے اس لئے محفوظ رہا کہ اس حصۂ ملک کے علماء اور عوام اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے عام طور پر مذہبی معاملات میں گالی گلوچ اور بازاری تقریروں کو بالکل پسند نہیں کرتے بلکہ اِلّا ماشاءاللہ دلائل کی دنیا تک اپنے اختلافات کو محدود رکھنے کے عادی ہیں۔

"خدمتِ اسلام" کی بعض جھلکیاں

تمام انبیاءؑ اور اُن کی پاک جماعتوں نے صداقت کو پھیلانے کے لئے اپنے اپنے رنگ میں جدّوجہد کی ہے اور اُن کی کوششوں کی تصویر تمام کتبِ مقدسہ میں آج تک محفوظ ہے۔ خصوصاً قرآن کریم نے اُن کے طریقِ تبلیغ اور اُن ذرائع کی نہایت ہی صاف اور پاکیزہ تصویر کھینچی ہے جنہیں وہ دنیا کو ہدایت اور نور کی طرف بُلانے کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں۔ اور اِس تصویر کشی میں ایک ایک نقش ایسا روشن اور اُجاگر کر دیا ہے کہ گویا آج اُن مقدّس لوگوں کو ہم اپنی آنکھوں کے سامنے اشاعتِ دین میں مصروف دیکھ رہے ہوں۔ آپ اُن سب کے حالات پر ایک نگاہ ڈالئے اور پھر اُس "خدمتِ اسلام" کی طرف

بھی ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھئے جسے ۵۳-۱۹۵۲ء کی "تحریک ختم نبوت" کے بانی مبانی خدا تعالےٰ اور اُس کے بزرگ ترین رسول خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی ناموس کے نام پر سر انجام دے رہے تھے۔ تحقیقاتی عدالت کے فاضل جج اپنی رپورٹ میں اِن کوششوں کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

"۲۵ر جولائی ۱۹۵۲ء کو قصور میں نماز جمعہ کے بعد ایک جلسہ ہوا جس کے مقررین میں ایک عالم شاہ بدمعاش بھی تھا۔ اس کے بعد چھاتی پیٹتا ہوا ایک جلوس نکالا گیا۔ ایک آدمی نعرہ لگاتا تھا "ظفر اللہ کنجر" اور دوسرے آواز ملا کر چلاتے تھے "ہائے ہائے"۔ اس کے بعد عالم شاہ اور ایک اور آدمی کہیں سے ایک گدھی لے آئے جس پر "بیگم ظفر اللہ" کے الفاظ لکھ دیئے۔ پھر اُس پر ایک آدمی کو سوار کرایا اور اُس آدمی کو جوتیوں کا ہار پہنا دیا۔ یہ شخص "ٹاپ ہیٹ" سر پر رکھے تھا جس پر "غلام احمد مرزا" لکھا تھا۔ یہ جلوس احمدیوں کے ایک کارخانہ کے سامنے رُکا اور پندرہ منٹ تک یہ نعرے لگاتا رہا "مرزائیت کو تباہ کر دو"۔ "ظفر اللہ کنجر"۔

"ظفر اللہ کتا" ۔ "ظفر اللہ سوٗر" [۱]۔

خدارا اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ ہمارے مقدس آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے طریقِ تبلیغ سے اس طریق کو کوئی بھی نسبت ہو سکتی ہے؟ ....

ہر سچا مسلمان بلکہ ہر سلیم الفطرت انسان کا دل یہ گواہی دے گا کہ نہیں یقیناً نہیں۔ یقیناً نہیں۔ یقیناً نہیں۔ ظلمت کو بھی نور سے اتنی دور کی نسبت نہیں جتنی اس طریقِ تبلیغ کو ہمارے آقا کے پاکیزہ طریق سے تھی۔ پھر کیوں دل خون کے آنسو نہ روئے یہ سوچ کر اسلام کا یہ مذاق کسی دشمنِ اسلام نے نہیں اُڑایا بلکہ اُن لوگوں نے اُڑایا جو علمائے اسلام ہونے کے دعویدار تھے۔ چنانچہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسٹر انور علی ڈی۔ آئی۔ جی نے لکھا کہ :۔

"مذہبی جنونیوں اور مولویوں نے طاقت پکڑ لی ہے اور غنڈے بھی میدان میں کود پڑے ہیں" [۲]

کیا اس کی کوئی ایک مثال بھی تاریخ انبیاء سے مل سکتی ہے کہ خدا تعالیٰ کے انبیاء اور اُن کے حامیوں نے "غنڈوں" کی حمایت

---

[۱] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۲۵۶ ۔ [۲] رپورٹ صفحہ ۲۵۶

حاصل کرکے خدمتِ دین کے لئے کوئی اِس نمونہ کا جلوس نکالا ہو؟ کیا مذہب کے تصور کی اِس سے زیادہ تحقیر ممکن ہے؟ ......

مگر یہ تو اِس قسم کے سینکڑوں مظاہروں میں سے صرف ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے اور جوں جوں وقت گزرتا گیا علماء کی تقریریں زیادہ اشتعال انگیز ہوتی چلی گئیں اور بے شمار سینوں میں آتشِ غیظ و غضب بھڑکنے لگی اور وہ کثیر التعداد لاعلم عوام جنہیں اپنے آقاؐ کے اُسوۂ حسنہ کی کچھ بھی خبر نہ تھی اِن علماء کے بتائے ہوئے طریق پر "خدمتِ اسلام" میں مصروف ہو گئے اور پھر اُس نیک رسم کی بیخ کنی کی جانے لگی جسے دنیا میں قائم کرنے کے لئے عرب کے اُفق سے وہ بے مثال نُور چمکا تھا۔ چنانچہ سیالکوٹ کا اِسی قسم کا ایک مشتعل ہجوم:۔

"منڈیروں پر سے اینٹیں پھینکنے لگا۔ جن کی وجہ سے پولیس نے اُن گاڑیوں کے پیچھے پناہ لی جو دارالشہابؓ کے سامنے سڑک پر کھڑی تھیں۔ خشت باری کی وجہ سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، سپرنٹنڈنٹ پولیس اور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے چوٹیں آئیں۔ ایک سب انسپکٹر پولیس کے چھرا گھونپ دیا گیا۔"[1]

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۱۴۶

اور اِسی شہر میں ایک اَور مقام پر:۔

"تیسرے پہر ایک ہجوم نے ایک اے۔ ایس۔ آئی اور ایک کانسٹیبل پر یورش کی۔ اے۔ ایس۔ آئی کا ریوالور اور کنسٹیبل کی بندوق چھین لی۔ اور اُن کی وردیاں جلا دیں۔ ایک اَور پیادہ کانسٹیبل کسی کیس کی مملوکات لئے جا رہا تھا اُس پر حملہ کیا گیا اور مملوکات چھین لی گئیں۔ دو احمدیوں کے چھرا گھونپ دیا اور تین دوسرے احمدیوں کے مکان لُوٹ لئے گئے[1]"

جب انسان ان حالات کو پڑھتا ہے تو بے اختیار یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایک اے۔ ایس۔ آئی اور ایک کانسٹیبل پر یورش سے اسلام نے کس میدان میں فتح حاصل کی؟ اور اُن دو احمدیوں اور اُس انسپکٹر پولیس کے خون سے جن کو چھرا گھونپا گیا اسلام کی رگوں میں کونسا تازہ خون دَوڑنے لگا؟ اور اُس لُوٹے ہوئے مال سے جو اُن تین احمدیوں کے گھروں سے لُوٹا گیا اسلام کے خزانوں کو آخر کیا تقویت پہنچی؟ اور کیا اسلام کا خدا واقعی عرش پر سے اس ماجرا کو دیکھ کر خوش

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۱۷۸

ہو رہا تھا جو دار الشہابیہ کی گلیوں میں گزرا؟ اور وہ پتھر جو دار الشہابیہ
کے بالاخانوں سے چند مسلمان پولیس افسروں پر برس رہے تھے کیا واقعی
رضائے الٰہی کے جذب کرنے والے پتھر تھے؟ ایک انسان یہ سوچنے پر
بے اختیار مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا نعوذ باللہ سیدِ ولدِ آدمؐ کا طریقِ تبلیغ
بھی اسی طریق کے مشابہ تھا؟ مگر اس مقام پر انسان کا فکر طائف
کی گلیوں سے ٹکرا کر ناکام و نامراد واپس لوٹ آتا ہے اور اُسے اس
نظارہ کی کوئی نظیر بھی آنحضرتؐ کی مقدس زندگی میں نظر نہیں آتی۔ اگر وہ
کچھ دیکھتا ہے تو یہی کہ خدا کا وہ سب سے پیارا رسولؐ نہتّہ اور یکّہ و تنہا،
ایک بے پناہ عزم اپنے دل میں سمائے اپنے رب پر توکّل کرتے ہوئے
عرب کی سنگلاخ ترین زمین پر آباد ایک بدقسمت بستی میں اس اُمید پہ
داخل ہوتا ہے کہ شاید یہ لوگ اُس آسمانی پیغام کو قدر کی نگاہ سے
دیکھیں۔ جسے مکّہ کے سرکش سرداروں نے ٹھکرا دیا تھا۔ اس کے
ہونٹوں پر کوئی سخت کلمات نہیں، اُس کے ہاتھوں میں کوئی پتھر نہیں اُس
کی جھولی سنگریزوں سے خالی ہے، اُس کے ہونٹوں پر محبت میں ڈوبی
ہوئی ابدی صداقتیں اور توحید کا لازوال پیغام ہے اور اُس کی جھولی
آسمانی رحمتوں سے بھرپور ہے۔ وہ یہ منادی کرنے آیا ہے کہ اپنے رب
پر ایمان لے آؤ۔ وہ انہیں نیک باتوں کا حکم دینے کے لئے آیا ہے اور

بُری باتوں سے رُکنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ انہیں بڑے پیار سے نصیحت کرتا ہے کہ ظلم اور تعدی سے باز آجاؤ اور غصب اور چوری اور لوٹ مار سے پرہیز کرو مگر اُس رسولؐ کی طرف سے توحید اور سلامتی اور امن کے اس پیغام کو سُن کر اُس بدبخت بستی کے بدقسمت سردار عبد یالیل کی غیرت جوش میں آجاتی ہے اور وہ اپنے خداؤں کی یہ ہتک برداشت نہیں کر سکتا اور اپنی آنکھ کے اشاروں سے گلیوں کے اوباش لونڈے اُس کے پیچھے لگا دیتا ہے۔ اُن کے ہونٹوں پر غلیظ گالیاں ہیں۔ اُن کے ناپاک ہاتھوں میں پتھر ہیں اور اُن کی جھولیاں سنگریزوں سے بھری ہوئی ہیں مگر اس مقدس رسولؐ کا عزم غیر متزلزل ہے اور اپنے اندازِ تبلیغ میں ایک سرِ مو بھی فرق نہیں کرتا۔ اُن بے رحم پتھروں کی چوٹوں سے اُس کا انگ انگ دُکھنے لگتا ہے اور اُس کے دل کے دُکھ کا سوائے خدا کے اور کوئی راز دان نہیں۔ اُس کا خون طائف کی گلیوں میں بے محابا بہنے لگتا ہے مگر آسمانی آقا کے سوا کسی کو اُس خون کی خبر نہیں جو اُس کے دل سے اس غم سے ٹپک رہا تھا کہ کہیں یہ ظالم لوگ اِس ظلم سے ہلاک نہ ہو جائیں۔ اور اِن سب دُکھوں اور گالیوں اور صدموں کے جواب میں جو وہ اُن ننگِ انسانیت ظالموں کے ہاتھوں سے اُٹھاتا ہے اُس کے دل اور اُس کے دماغ اور اُس کی زبان پر ایک ہی دُعا طاری اور جاری وساری ہے کہ

اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ اے میرے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے دے کہ یہ لوگ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔

یہ تھا وہ طریقِ تبلیغ جسے آپؐ نے اختیار کیا۔ مخالف اپنے راہِ ظلم و ستم پر جمے رہے اور آپؐ اپنے طریقِ رحم و شفقت پر قائم۔ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کی ایک عجیب تصویر نظر آتی تھی۔ ظالموں پر تو یہ وحشت سوار تھی کہ جس طرح بن پڑے آپؐ کو ہلاک کردیں۔ اور آپؐ کو یہ غم تھا کہ کہیں ظالم ہلاک نہ ہو جائیں۔ آپؐ نے صرف فلاح اور کامرانی کی طرف زبانی دعوت پہ ہی اکتفاء نہ کی بلکہ اِس راہ میں دن بھر کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد ساری ساری رات اپنے خدا کے حضور رو رو کر کاٹ دی کہ اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ!۔ اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ!! یہاں تک کہ اِس دردمند دل کے گہرے سوز و گداز کو دیکھ کر خدا تعالیٰ بھی عرش سے پکار اُٹھا:۔

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ○

(شعراء ۴)

کہ اے میرے عزیز ترین بندے! "کیا تو اِس غم میں اپنی جان کو ہلاک کر دے گا کہ یہ ایمان نہیں لاتے؟"

یہ تھا وہ طریقِ تبلیغ جو آپؐ نے اختیار کیا اور یہی وہ دُعائیں تھیں اور یہی آپؐ کے سینے کے وہ پُر پیچ و تاب غم تھے جو ایک دن عرب کی سرزمین پر خوش خبریاں بن کر ظاہر ہوئے اور بشارتیں بن کر فارس کے اُفق پر چمکے!۔

جھوٹ کہتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ میرے آقا کا یہ طریقِ تبلیغ ضائع گیا اور بہتان باندھتا ہے وہ شخص جس کے نزدیک اُس کی سب دردمندانہ دُعائیں فضا میں پراگندہ ہوگئیں اور دَورِ مظلومیت رائیگاں گیا اور اگر کچھ کام آیا تو تیر کام آئے اور تلواروں نے فائدہ دیا۔ کاش کہ وہ یہ جانتا کہ گو تیر ہی کام آئے مگر نیم شبی دُعاؤں کے وہ تیر جو کبھی خطا نہیں جاتے اور تلواروں ہی نے فائدہ دیا مگر صبر و استقلال، شرافت و نجابت، براہین اور معجزات کی اُن تلواروں نے جن کی دھار قلوب کی اتھاہ گہرائیوں تک مار کرتی ہے۔ کہاں ہیں وہ علماء جو تاریخ اسلام سے واقفیت کا دعوےٰ کرتے ہیں اور کہاں ہیں وہ خُدّامِ دین جو خدمتِ اسلام کی تمنّائیں لئے ہوئے ہیں؟ کیا کوئی ہے اُن میں جو خدمتِ دین کی اِن کٹھن وادیوں کو طے کر سکے جنہیں ہمارے آقا اور اُس کے سچے عُشّاق کی جماعت نے تقریباً چودہ سو برس پہلے طے کر کے دکھایا تھا؟ کیا کوئی ہے اِن میں جو رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس طریقِ تبلیغ کو اختیار کر سکے جس کا اختیار

کرتا ہزار مشقتوں اور لاکھ مصائب و آلام کو دعوت دیتا ہے اور اُس کی پیروی میں صبر و استقلال، حلم و رُشد، شرافت و نجابت اور رحمت و شفقت کے وہ اعلیٰ نمونے دکھائے جنہوں نے پُر وحشت صحرائی دلوں کو بھی رام کر لیا تھا اور جس کے دامِ محبت میں طائف کا عبد یا لیل بھی آخر اسیر ہو کر رہا۔ جس کے دشمن فدائی بن گئے اور خون کے پیاسے غلامانِ در بن گئے؟ ——

؎ کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

مگر یہ عجیب بدقسمتی کا دور ہے کہ "حریفِ مئے مرد افگنِ عشق" تو کوئی نہیں ہوتا ہاں اُس کیف و مستی کے سب خواہاں ہیں جو صرف اس مئے عشق ہی میں مضمر ہے۔ اور وہ نہیں جانتے کہ اٹل قوانینِ قدرت کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔

مَیں اپنے مضمون کے تسلسل کو توڑ کر کہیں اور نکل آیا ہوں۔ دراصل آج سے چودہ سو برس پہلے کے اندازِ تبلیغ کی دلنشینی نے مجھے ایسا جذب کر لیا کہ مَیں کچھ دیر کے لئے اسلام کے اُس شاندار ماضی میں محو ہو گیا جس کی یاد دل میں چٹکیاں لیتی ہے۔ اور بھول گیا کہ مَیں تو اپنے گرد و پیش کی، اِس ملک کی اور آج کل کی باتیں کر رہا تھا اور زیرِ نظر وہ طریقۂ تبلیغ تھا جس کا نظارہ ہم نے ۱۹۵۳ء میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جو دُور ہمارے دلوں پر

بلیتا:۔

"ایک بڑا ہجوم اُس مسجد کی طرف جارہا تھا۔ اُس کو راستے میں روک لیا گیا۔ کمشنر کی ہدایت کے مطابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ہجوم کو منتشر ہونے کا حکم دیا لیکن وہ افسروں پر پل پڑا۔ پولیس کو اس ہجوم پر لاٹھی چارج کا حکم دیا گیا۔ جس کے جواب میں آس پاس کے مکانوں سے اینٹیں برسائی گئیں۔ مسٹر خلیل الرحمٰن اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سر پر شدید زخم آیا اور پولیس کی ایک گاڑی توڑ پھوڑ دی گئی[1]"

اور صرف اینٹیں برسانے پر ہی اکتفاء نہیں کی گئی بلکہ علماء کے بتائے ہوئے تبلیغ اسلام کے طریق پر عمل پیرا ہوتے ہوئے:۔

"۷ مارچ کو موضع ننڈپور میں شورش پسندوں کے ایک ہجوم نے ایک شخص محمد حسین کو یہ سمجھ کر قتل کر دیا کہ وہ احمدی ہے۔ تفتیش سے معلوم ہوا کہ متوفّی کے ایک دشمن نے اُس کو قتل کرانے کے لئے یہ چال چلی تھی[2]"

پھر اُن مسجدوں کو نذرِ آتش کرنا بھی تبلیغِ اسلام کا ایک جزء سمجھا

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ ص ۱۷۸۔ [2] رپورٹ ص ۱۸۳

گیا جو محض اس لئے تعمیر کی گئی تھیں کہ اُن میں خدائے واحد و یگانہ کی پرستش کی جائے ۔ چنانچہ راولپنڈی میں :۔

"۶ مارچ کو لیاقت باغ میں ایک اور جلسہ منعقد ہوا۔ ایک ہجوم نے جلسہ کے بعد منتشر ہو کر مری روڈ کا رُخ کیا اور احمدیوں کی ایک مسجد کو اور ایک چھوٹی موٹر کار کو آگ لگا دی[۱]۔"

اور لُوٹ مار کو بھی خدمتِ اسلام کا حصہ سمجھا جانے لگا اور مسجد اور کار کو آگ لگانے کے بعد :۔

"اُسی شام کو کچھ دیر بعد لُوٹ مار اور آتش زنی کے مزید واقعات بھی رونما ہوئے۔ احمدیہ کمرشل کالج، نُور آرٹ پریس اور پاک ریسٹوران شہر کے مختلف حصّوں میں واقع تھے لیکن لوگ زبردستی اُن میں گھس گئے اور اُنہوں نے مختلف اشیاء کو لُوٹنے، جلانے اور تباہ کرنے کی کوشش کی۔ ایک غیر احمدی نوجوان نُور آرٹ پریس میں ملازم تھا اُس کو احمدی سمجھ کر چھرا مارا گیا اور وہ اُسی زخم کی وجہ سے ہلاک ہو گیا[۲]۔"

---

[۱] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ ص۱۸۵ ۔ [۲] رپورٹ ص۱۸۵

پھر وہ وقت آیا کہ یہ "تبلیغِ اسلام" کا جذبہ بے پناہ اور بے اختیار ہوگیا اور نظم وضبط کے ہر دائرہ کو توڑ کر آزاد ہوگیا۔ احمدی اور غیر احمدی میں کوئی تمیز باقی نہ رہی اور جاندار اور بے جان کا فرق کرنا مشکل ہوگیا۔ تخریب کی ہر کارروائی اسلام کی فتح متصور ہونے لگی حتیٰ کہ اسی مقدس نام پر بلا امتیازِ مذہب معصوم بیبیوں کو بے آبرو کیا گیا۔ لائل پور میں :۔

"دس ہزار کے ایک ہجوم نے ضلع کی کچہریوں پر حملہ کر دیا۔ کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ مجسٹریٹوں کو عدالتیں بند کرنے پر مجبور کر دیا اور پھر ڈپٹی کمشنر کے گھر میں گھس گئے۔ لائل پور کاٹن ملز کی ایک خوردہ فروشی کی دکان لوٹ لی گئی۔" (خدا جانے اُس کے کتنے معصوم بچوں نے بھوک سے بلک بلک کر وہ رات گزاری ہوگی۔ کیا یہ سب خدا تعالےٰ کی خوشنودی کی خاطر کیا گیا؟ ناقل)

"ریل کی پٹڑی توڑ دی گئی اور تین ٹرینیں ریلوے سٹیشن کے قریب روک لی گئیں۔ ریلوے سٹیشن پر دکانوں اور مسافروں کو لوٹا گیا۔ ٹرین پر بعض عورتیں بے آبرو کی گئیں۔ اور ایک کیبن مین بری طرح زخمی کیا گیا۔"[۱]

---

[۱] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۱۸۱

اور آسمان نے سخت حیرت و استعجاب اور دُکھ کے ساتھ یہ نظارہ دیکھا کہ "تبلیغِ اسلام" کا یہ بھی ایک طریق ہے !!!——

اوکاڑہ بھی اِس طرزِ ستم میں لائل پور سے کچھ پیچھے نہیں تھا۔ جہاں :-

"تین ہزار کا ایک ہجوم ریلوے سٹیشن پر پہنچا اور اُس نے ڈاؤن پاکستان میل کو تین گھنٹے تک روکے رکھا۔ ہجوم نے ڈبّوں کی کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ ٹرین کو روکنے والی ویکیم کی زنجیریں توڑ ڈالیں اور مسافر عورتوں کو بے آبرو کیا گیا[1]"

اِن واقعات کو نقل کرتے ہوئے جو میرے دل کی کیفیت ہے مَیں اُسے بیان نہیں کر سکتا۔ وہ الفاظ میرے قبضۂ قدرت میں نہیں جو مختلف متلاطم اور متقابل جذبات کے یکجا ہونے کی وجہ سے میرے سینہ کے ہیجان کا نقشہ کھینچ سکیں۔ مگر مَیں ہر منصف دل سے سوال کرتا ہوں جو دُنیا کے کسی بھی مقدّس رسول کی طرف منسوب ہوتا ہو کہ کیا کسی ایک رسول کی رُوح بھی اِس تصوّر سے خوش ہو سکتی ہے کہ اُس کے تقدّس کے نام پر "عورتوں کو بے آبرو" کیا جائے؟ ....

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۱۹۰

میرے آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم پر بہت ظلم توڑے گئے ہیں مگر شاید یہ ظلم اُن سب ظلموں سے بڑھ کر ہے !!! ۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مجھے اُن عوام پر غصہ نہیں آتا جن کے ہاتھوں سے یہ ظلم سرزد ہوئے اور اُن مسجدوں کے جلانے والوں سے کوئی پرخاش نہیں۔ چھرا گھونپنے والوں کو بھی میرا دل معاف کر سکتا ہے اور بے اختیار اپنے مُطاعؐ کی پیروی میں دل سے یہی دُعا نکلتی ہے کہ اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمَنَا فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ ”اے اللہ! ہماری قوم کو ہدایت دے کہ یہ نہیں جانتے۔“ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا یہ شعر میرے جذبات پر مستلط ہو جاتا ہے کہ:۔

اے دل تو نیز خاطرِ ایناں نگاہ دار
کآخر کنند دعویٰ حُبِّ پیمبرم

”اے دل تو اِس طرف بھی نگاہ کر کہ آخر یہ لوگ میرے ہی رسولؐ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔“

مگر بڑے ہی بھاری عزم کی ضرورت ہے اُن علماء کو معاف کرنے کے لئے جو سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کو غلط راستوں پر چلانے کے ذمہ دار ہیں اور اُن نیک مقاصد کی بیخ کنی کرتے ہیں جن کا

پودا اُس مقدّس رسولؐ نے خود اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔

ہاں ایک تصوّر ہے جو ہر غصّہ کو ٹھنڈا کر رہا ہے اور ایک یاد ہے جو ہر جذبۂ نفرت کو کالعدم کر رہی ہے۔ وہ تصور رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ کے پُر رحمت دل کا تصوّر ہے اور وہ یاد فتحِ مکّہ کے دن کی یاد ہے! — یہ تصوّر اور یہ یاد ہر نفرت اور ہر غصّہ کو گداز کر کے ایسے جذباتِ درد و غم میں تبدیل کر دیتی ہیں کہ دل آہوں کا دُھواں بن جاتا ہے اور دُعائے نیک کے سوا کوئی خواہش باقی نہیں رہتی۔ خدا جانے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل سے یہ دُعائے نیک کس شدّت اور کس کرب کے ساتھ اُٹھتی ہو گی کہ عرش کا خدا بھی پکار اُٹھا: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ کیا تُو اپنی جان اس غم میں ہلاک کر لے گا کہ یہ ایمان نہیں لاتے۔!!!

اجتماعِ ضدّین

> اِن مخصوص متشدّد راہنماؤں کے نظریات ایک عجیب وغریب اجتماعِ ضدّین کا منظر پیش کرتے ہیں۔ زود رنجی اور سخت بے حسی، وہمی خطرات کا بچھاوا اور حقیقی خطرات سے لاپرواہی اِن کی شخصیت کے مرکزی خدوخال ہیں!

گزشتہ ابواب کے مطالعہ سے قارئین پر بخوبی واضح ہو چکا ہو گا کہ مذہب کے نام کو بعض خود غرض مذہبی راہنما جس ظالمانہ بے دردی سے استعمال کرتے ہیں شاید ہی کوئی اور نام اس بے دردی سے استعمال ہوا

ہو۔ بایں ہمہ اُسے ہرگز اُن مظالم اور خونریزیوں کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا جو اِس نام پہ کی جاتی رہی ہیں اور آج بھی کی جاتی ہیں۔ کیا دیانت کے نام پہ اگر بددیانتی کی جائے تو دیانت کے پاکیزہ چہرہ پہ کوئی داغ لگ سکتا ہے؟

دراصل انفرادی یا قومی اعمال کسی فرد یا قوم کے ذہنی رجحانات اور قلبی کیفیات کا آئینہ دار ہوا کرتے ہیں۔ یہ جو ہم اپنے گرد و پیش میں معاشرہ کی تصویر دیکھتے ہیں یہ ہمارے ہی تصورات اور اخلاق کے خد و خال ہیں۔ یہ بحیثیت قوم ہمارے باطن کا وہ عکس ہے جو آئینۂ قدرت ہمیں دکھا رہا ہے۔ جس قدر بھی کسی قوم کا باطن پاک و صاف ہوگا اور جیسے جیسے بھی قومی اخلاق پر صفاتِ الٰہی کے بے مثال حُسن کا رنگ چڑھا ہوگا اُسی قدر یہ تصویر زیادہ جاذبِ نظر اور دلکش بنتی چلی جائے گی۔ یہ تصویر خود بخود قوم کے اخلاق کے بننے اور بگڑنے کے ساتھ ہی بنتی اور بگڑتی رہتی ہے اور قومی اخلاق کے بننے اور بگڑنے میں مذہبی علماء کے اخلاق کا غیر معمولی دخل ہوا کرتا ہے۔ بڑی ہی قابلِ رشک اور خوش قسمت ہوتی ہے وہ قوم جس کے راہنماؤں کے اخلاق تقویٰ اللہ کی مضبوط اور غیر متزلزل چٹان پر قائم ہوں۔ اس کے سوا ہر دوسری زمین ناقابلِ اعتماد ہے۔ اور وہ قوم بڑی ہی بدقسمت ہوا کرتی ہے جس کے راہنماؤں کی اخلاقی اور نظریاتی عمارت اس چٹان

پر قائم ہو۔ جو عدل اور انصاف، امانت اور دیانت، وسیع حوصلگی اور حلم کی اعلیٰ صفات سے عاری ہو چکے ہوں۔

کیا اس سے بڑھ کر بھی کسی مذہبی قوم پر کوئی ادبار آ سکتا ہے کہ اسکے راہنما تنگ نظر اور بے حوصلہ ہو جائیں؟ اور اپنے باہمی اختلافات میں میزانِ عدل سے کام لینا ترک کر دیں۔ جن نظریات کو قائم کرنے کے وہ دعویدار ہوں خود اپنے اعمال سے انہی کی بیخ کنی کر رہے ہوں۔ اگر ایسا ہو تو اُس قوم کے معاشرہ کے دن لکھے جاتے ہیں اور اس کے اخلاق کی جو تصویر بنتی ہے وہ دیکھی نہیں جاتی۔ ایسی قوم یقیناً بدقسمت ہوتی ہے اور ایسے علماء ایسی روحانی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں جو دن بدن بڑھتی رہتی ہیں۔ اُن کے دل و دماغ کو ایک گھن سا لگ جاتا ہے جو اندر ہی اندر اُن کے نظریات اور جذبات کو کھاتا رہتا ہے اور تمام نظامِ عقل و احساس کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ خود غرضی اُن کی پہچان ہوتی ہے اور تنگ حوصلگی طرۂ امتیاز۔ ہر دوسرے شخص کے عقائد پر یہ خدائی فوجدار بن کر نگران ہو جاتے ہیں اور خدا کی غلامی کے نام پر یہ دُنیا کو اپنے نظریات کی غلامی پہ مجبور کرتے ہیں۔ ان کی طبیعت سخت متضاد خصوصیات کی حامل ہوتی ہے اور ایک طرف تو کسی دوسرے فرقہ کے ائمہ اور بزرگان کے متعلق سخت گندی اور ننگِ انسانیت زبان استعمال کرنے سے بھی اُن کے نزدیک کسی کی

دِل آزاری نہیں ہوتی اور دوسری طرف اُن باتوں پر بھی بھڑک اُٹھتے ہیں جو اُن کے لئے باعثِ انبساط ہونی چاہیئے تھیں۔ چنانچہ یہ بے دھڑک مخالف فرقوں کے بزرگان پر گند اچھالتے ہیں۔ بلکہ اُن کی مقدس ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے متعلق بھی نہایت ناپاک حملے کرنے سے باز نہیں آتے اور یوم آخرت کو بالکل بھلا بیٹھتے ہیں۔ اگرچہ نقلِ کفر کفر نہ باشد کا مقولہ درست ہے مگر پھر بھی میری بساط سے باہر ہے کہ میں اُس زبان کے چند نمونے یہاں پیش کر سکوں جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں۔ اگر قارئین کو ذاتی طور پر کسی ایسی تقریر سُننے کا یا ایسی کتاب پڑھنے کا تلخ تجربہ نہیں ہُوا اور وہ اِس بارہ میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں تو تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ میں وہ اِس "مذہبی" طریقِ کلام کے چند نمونے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ ویسے جیسا کہ میں نے پہلے نقل کیا ہے فاضل ججوں کا قلم بھی اِس قسم کے تمام نمونوں کو نقل کرنے کا متحمل نہیں ہو سکا

پس ایک طرف تو اِن کا احساس اتنا کُند ہو جاتا ہے کہ ہر قسم کی شدید ترین دل آزاری اور بہتان طرازی اُن کے نزدیک ایک اظہارِ واقعی بن جاتا ہے اور وہ عام انسانی شرافت سے بھی بہت نیچے اُتر آتے ہیں اور دوسری طرف اُن کے جذبات اِس قدر زود حس اور بھڑکیلے

ہو جاتے ہیں کہ بعض فرقوں کی مسجدوں کی تعمیر بھی برداشت نہیں ہوتی اور جلتی پر تیل کا کام کر جاتی ہے۔ پھر اُن کی آتشِ غضب نہیں ٹھنڈی ہوتی پر نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ مسجد نذرِ آتش یا مسمار نہ کر دی جائے۔ اور یہاں اور وہاں سمندری یا لاوہ لینڈٹی یا سرگودھا میں ایک یا دو مسجدیں گرا کر وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ شاید انہوں نے اسلام کی ایک عظیم الشان خدمت سر انجام دی ہے اور اُن کے دلوں میں اِس فتحِ عظیم کے نقارے بجنے لگتے ہیں۔

ایک طرف تو وہ اُن تمام خطرات سے یکسر آنکھیں موند لیتے ہیں جو ایک مدت سے اسلام کے دل کو کھا رہے ہیں اور اندرونی طور پر بھی اور بیرونی طور پر بھی اِس شدت سے اِس مظلوم مذہب پر حملہ آور ہیں کہ اُن کے خیال سے بھی ایک صاحبِ دل مسلمان کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جانی چاہئیں۔ اور دوسری طرف بعض وہمی اور غیر موجود خطرات کے پیچھے اِس جوش و خروش کے ساتھ پڑے ہوئے ہیں جیسے کوئی بھوت کے تصور کے پیچھے لٹھ لیکر بھاگ رہا ہو اور کہے کہ میں دم نہیں لوں گا اور چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک کہ اسے میرے تصور کے بھوت! میں لاٹھیوں سے کوٹ کوٹ کر تیرے ٹکڑے نہ اُڑا دوں۔ چنانچہ وہ روزمرہ کی زندگی میں اپنے شہروں میں، اپنے قصبات میں، اپنے گاؤں کی گلیوں میں، اُن گھروں میں دیکھتے ہیں جن میں وہ رہتے ہیں کہ بد دیانتی قوم میں اِس طرح سرایت کر گئی ہے جیسے سمندر میں ڈوبے ہوئے

شہوت کے کپڑے میں پانی (سوائے اُن کے جو تقویٰ اللہ کا لباس اوڑھے ہوئے ہوں اور ہر قسم کے شیطانی نفوذ سے پاک ہوں) وہ شہوت سنانی کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن پاتے ہیں۔ اور چوری اور ڈاکہ اور ظلم اور بدنظری اور بے حیائی کو عام ہوتا ہوا دیکھتے ہیں اور اسلام پر یہ ظلم اُن کی نظروں کے سامنے اُن کی سماعت کی حدود میں اُن کے آگے اور اُن کے پیچھے، اُن کے دائیں اور اُن کے بائیں توڑے جارہے ہیں۔ وہ مسجدوں کو ویران پاتے ہیں اور دلوں کو خدا تعالیٰ کے ذکر اور اُس کی یاد سے خالی دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ مذہبی دُنیا نہایت سُرعت کے ساتھ لامذہبیت کی طرف دَوڑی چلی جارہی ہے اور ہر روز اور ہر شب مذہب کی زمین تنگ ہوتی جاتی ہے۔ مگر مذہب کے لئے اُن کی رگ حمیت جوش میں نہیں آتی اور اُمّتِ محمدیہ کی اخلاقی تعمیرِ نَو کے لئے وہ دردِ دل محسوس نہیں کرتے اور محض خشک فتووں پر اکتفاء ہے۔ حالانکہ یہ گھُن وہ گھُن ہے جس نے اسلام کے جسم کو ایک بیمار لکڑی کی طرح کھوکھلا کر رکھا ہے!۔

حق تو یہ تھا کہ وہ اِن خوفناک بیماریوں سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لئے مُستعِد اور کمربستہ ہوجاتے اور اِس راہ میں اپنی جان، مال، وقت اور عزت کی کچھ پرواہ نہ کرتے ـــــ سخت کرب اور اضطراب اور گہرے دُکھ اور جذبۂ ہمدردی کے ساتھ وہ لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے۔ وہ اپنے

آقا کی اُمّت کے بیمار افراد سے کم از کم ویسی ہی محبت کا اظہار کرتے جیسی ایک ماں اپنے بیمار بچے سے کرتی ہے۔ دیکھو وہ اُس کو بچانے کے لئے ہر امکانی کوشش کرتی ہے۔ کبھی ڈاکٹروں کی طرف دوڑتی ہے کبھی حکیموں کے دروازے کھٹکھٹاتی ہے اور کبھی اپنے بچے کو چھاتی سے لگا کر اُس کی بلائیں لیتی ہے۔ اور اگر ایسی ہی نادار ہو کہ علاج کے لئے کوئی پیسہ نہ رکھتی ہو تو فاقے کاٹ کر یا بھیک مانگ کر بھی اپنے جگر گوشے کے لئے دوا لے آتی ہے اور دن کی تھکی ہاری راتوں کو بھی چین سے نہیں سوتی۔ اور آنکھ لگ بھی جاتی ہے تو خوف و ہراس سے ٹھٹھک کر اُٹھتی ہے اور بچہ پر ہراساں اور ترساں نگاہیں ڈالتی ہے اور جب اُس کی بے قراری کو دیکھ کر کسی پہلو قرار نہیں آتا تو روتی اور گڑگڑاتی ہوئی سجدے میں جا گرتی ہے کہ اے میرے آقا! اے میرے آقا! مجھ سے تو کچھ بن نہیں پڑتا! میں تو بے بس ہوئی جاتی ہوں! تو ہی فضل فرما اور میرے بلکتے ہوئے لال کو شفا دے دے۔ !!! یہی جذبۂ ہمدردی ہے جو قوموں کی شفایابی کا موجب بنتا ہے اور اُکھڑے ہوئے سانسوں کو قائم کر دیتا ہے۔ جو اخلاق کی بجھتی ہوئی رسوم کو پھر روشنی بخشتا ہے اور مذہب کے مٹتے ہوئے نقوش کو پھر سے اجاگر کر دیتا ہے۔

اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں! کوئی چارہ نہیں!

یہی وہ جذبۂ محبت ہے جو بنی نوع انسان کی ہمدردی میں ایک لاگھ

چوبیس ہزار انبیاءؑ کے سینوں میں موجزن رہا اور یہی وہ جذبۂ محبّت ہے جو عرب کے ایک امّی نبیؐ کے دل سے رحمتوں کا سرچشمہ بن کر پھوٹا اور ایک عالم کو سیراب کر گیا۔ اور وہ آسمانی پانی یہی ہے جس نے صدیوں کے گندے دلوں کی مَیل کو اِس طرح الگ کر دیا جیسے بھٹی گندے کپڑوں سے مَیل کو کاٹ کر الگ پھینک دیتی ہے لیکن افسوس ہے کہ اِس طرف کسی کی نگاہ نہیں اُٹھتی اور دل سخت اور خشک ہو گئے۔ درد میں ڈوبی ہوئی تقریروں کی جگہ خشک خشمگین فتووں نے لے لی اور سینہ دُعا سے اِس طرح خالی ہو گیا جیسے وہ گھونسلا جسے پرندہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ چکا ہو۔ کچھ تو وہ ہیں جو ناصح ہونے کا دعویٰ ہی ترک کر بیٹھے اور "خدائی فوجدار" بن کر اُمّت کی اصلاح کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور کچھ وہ ہیں جو ناصح تو رہے مگر نصیحت کے اطوار بدل دیئے۔ سخت کلامی اُن کا شیوہ ہو گیا اور جبر و تشدّد ذرائع اصلاح۔ اور کسی نے مُڑ کر نہ دیکھا کہ کیا کبھی پہلے بھی اِن راہوں پر چل کر بنی نوعِ انسان کی اصلاح ہوئی تھی؟

افسوس کہ در اصل اسلام کی سچی محبّت ہی باقی نہیں رہی ورنہ ممکن نہ تھا کہ یہ دردناک منظر دیکھ کر علماء کے دل پگھل نہ جاتے۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے کہ چاروں طرف حدِ نگاہ تک مذہب کی رُوح پسپا ہوتی جا رہی ہے اور لامذہبیت کی موت دلوں پر قبضہ کر رہی ہے۔ مگر علماء اِن حالات سے

مُنہ پھیرے ہوئے ہیں اور اپنی روشِ پارینہ کو بدلنے کے لئے تیار نہیں۔ انہیں کونسی زبان سمجھائے کہ روحانیت کی دُنیا پر سخت کلامی اور تشدّد کا سکّہ نہ کبھی پہلے چلا تھا، نہ آج۔ نہ کبھی آئندہ چلے گا۔ اور جو سکّہ اِس دُنیا پر چلتا ہے اُس سے خود اُن کا دامن بھی تہی ہے۔ ہر ایسی بے لوث خدمتِ اسلام اِن پر دُوبھر ہے جس کے سر پر اقتدار، ذاتی منفعت یا نام و نمود کے تمغے نہ لگے ہوں۔ اور ہر مشکل کام پر ان کا اجتماع مشکل ہے۔ آج ایک اذانِ تکفیر کے سوا اور کوئی اذان انہیں میدانِ عمل میں ایک ہاتھ پر جمع نہیں کر سکتی!

بیرونی حملے

یہ تو اندرونی حملوں کا حال ہے اور بیرونی حملوں کی یہ کیفیت ہے کہ چھوٹے چھوٹے کمزور مذہب بھی جنہیں ہم دیر ہوئی کہ مُردہ سمجھ کر پیچھے چھوڑ آئے تھے بیدار ہو کر اسلام پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ حتّٰی کہ عیسائیت بھی کہ جس کے عقائد کی بنیاد سخت کمزور اور کھوکھلے مفروضوں پر مبنی ہے اور جس کے دعاوی باہم دگر دست بگریباں ہیں اسلام کے خلاف دُنیا کے کونے کونے میں آوازیں بلند کر رہی ہے۔ گیدڑ تو شیروں کی طرح دندناتے پھرتے ہیں اور شیر گیدڑوں کی طرح کھوہوں میں دبکے بیٹھے ہیں۔ عیسائی پادریوں نے اسلام اور اسلام کے مقدس رسولؐ کے خلاف اتنی کتابیں شائع کی ہیں کہ دُنیا بھر میں مسلمانوں کی بھی اتنی تعداد نہیں ہے اور وہ ہر زاویہ سے ہر تیکھے ہتھیار کے ذریعہ اسلامی عمارت کی ایک ایک

اینٹ پر ضربیں لگا رہے ہیں۔ وہ آنحضرتؐ کی مقدس ذات پہ بھی حملہ آور ہیں اور اُمّہات المومنین پر بھی سخت ناپاک حملے کرتے ہیں۔ وہ اسلام کو ایک جابر اور قاہر مذہب کے طور پر پیش کرتے ہیں اور قرآن کریم کو محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کے دل کی گھڑی ہوئی باتیں قرار دیتے ہیں۔ ان کا علمِ تاریخ بھی اسلام پر حملہ آور ہے اور علمِ فلسفہ بھی۔ ان کا علمِ منطق بھی اسلام پر حملہ آور ہے اور علمِ طبعیات بھی۔ اور ان کی تہذیب نے اسلامی تہذیب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں مگر افسوس ہے کہ ہمارے علماء کو اس خطرہ پر بھی کوئی آگاہی نہیں اور اگر ہے تو جواب کی طاقت نہیں پاتے سوائے اس کے کہ حکومت سے مطالبہ کریں کہ اس ملک میں ان کافروں کی تبلیغ کو بزور بند کر دیا جائے۔ یہ نہیں سوچتے کہ آخر کہاں کہاں اور کس کس ملک میں اُن کی تبلیغ کو بزور بند کر سکیں گے اور مغربی تہذیب اور علوم و فنون کے چور دروازوں پہ وہ کون سے پہرے بٹھائیں گے جو بزورِ شمشیر شکوک کے ریلے کو مسلمانوں کے دل تک پہنچنے سے روک دیں۔ اور کیا صرف دماغ پر ہی اسلام کے احیاء کی ضمانت لی جاسکتی ہے؟ کیا یہ نہیں جانتے کہ ابھی تک دُنیا کی بھاری اکثریت اسلام کے نام سے بے بہرہ ہے۔ ابھی تو برِصغیر ہندو پاکستان میں ہی اسلام کو غلبہ حاصل نہیں ہوا۔ ابھی تو ہمیں امریکہ کو بھی اسلام کا پیغام دینا ہے اور روس کو بھی، چین کو بھی اور جاپان کو بھی۔ ایشیا

کے اکثر ممالک بھی ابھی تک اسلام سے کوسوں دور ہیں اور افریقہ کی بھی کثیر آبادیوں کو اسلام کی خبر نہیں۔ اور براعظم آسٹریلیا میں تو مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔

پس کیا اسلام کے عالمگیر غلبہ کے لئے ضروری نہیں کہ اِن دُور دراز تک پھیلی ہوئی وسیع آبادیوں کو اسلام کا پیغام پہنچایا جائے اور اُن جہل اور لاعلمی کے تہہ در تہہ پردوں کو اُٹھا دیا جائے جو دنیا کی آنکھ اور اسلام کے حسین چہرہ کے درمیان صدیوں سے حائل ہوئے پڑے ہیں۔ اور مغرب کے دل کو بھی فتح کر کے اپنے آقاؐ کے قدموں میں لا ڈالا جائے۔

اور کیا اسلام کی سربلندی کے لئے بس یہی کافی ہے کہ اپنی مسجد اور قباؤں کی محدود حدود میں بیٹھ کر عبادت کے تمام ظاہری ارکان کو ایک غیر روحانی سختی کے ساتھ ادا کر دیا جائے؟

مگر افسوس کہ اِن بیرونی خطرات کی طرف بھی اِن علماء کی آنکھ نہیں اُٹھتی اور اندرونی خطرات کی طرف بھی نہیں۔ اور اگر اُٹھتی ہے تو سخت تھکی اور ہاری ہوئی مایوس نگاہ یا ایک ایسی لاتعلق خالی نظر جو کسی خطرہ کے ادراک کی طاقت نہ رکھتی ہو۔ یہ مطلق اِس امر کا خیال نہیں کرتے کہ آج جبکہ اسلام کو سخت اندرونی اور بیرونی خطرات درپیش ہیں جو اسلامی جسم کے ایک ایک عضو، ایک ایک بند، ایک ایک جوڑ پر چوٹیں لگا

رہے ہیں اور کتنے ہی وحشی درندے ایک عرصہ گزر گیا کہ اسلام کی رگِ جان سے خون چوس رہے ہیں۔ ان کے نزدیک صرف ایک ہی خطرہ اسلام کو لاحق ہے ــــــ یہ خطرہ مختلف مسلمان فرقوں کے عقائد کا خطرہ ہے۔ عموماً یہ خطرہ احمدیت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی شیعہ عقائد کا خطرہ بن جاتا ہے، کبھی بریلوی عقائد کا اور کبھی اہلحدیث یا اہلِ قرآن کے عقائد کا۔

خصوصاً احمدیہ عقائد کے خطرہ نے تو ان علماء کو چاروں طرف سے اس طرح گھیر رکھا ہے جیسے ایک ڈراؤنا خواب ایک بچّے کے دل کو گھیر لیتا ہے اور وہ اپنے تصوّر میں ان وہمی بلاؤں سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ حقیقی خطرہ ان خوابوں سے نہیں بلکہ اس سانپ سے ہے جو اس کے دل کے قریب کنڈل مارے بیٹھا ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ بچّہ تو نیند کی حالت میں ہوتا ہے اور یہ جاگے ہوئے ہیں۔ اور بچّہ تو ڈرانے والی صورتوں سے ڈرتا ہے اور یہ ان صورتوں سے ڈر رہے ہیں جو ان کے لئے ترقی اور اسلام کے احیائے نَو کا پیغام لے کر آئی ہیں۔ صرف اسی پر بس نہیں بلکہ جان بُوجھ کر ان صورتوں کی طرف وہ نقوش منسوب کرتے ہیں جنکے تصوّر سے انہیں ڈر محسوس ہو۔ چنانچہ احمدی لاکھ کہیں اور خدا کے مقدّس نام لے لے کر قسمیں کھائیں کہ ہم اپنے محبوب ترین آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیّین یقین کرتے ہیں اور تمام انبیاء سے افضل اور برتر جانتے

ہیں۔ آپؐ کے دامِ محبت میں سرتاپا گرفتار ہیں اور ایمان رکھتے ہیں کہ آپؐ کی شریعت آخری اور کامل اور تمام بنی نوع انسان اور ہر زمانہ کے لئے ہے مگر یہ علماء نہیں مانتے اور اِس کے بالکل برعکس خیالات منسوب کر کے ہمیں بھیانک صورت میں دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ یہ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ کے اِس بیان کی طرف بھی مطلق نگاہ نہیں کرتے کہ :-

"ہمارے مذہب کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ :-

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ ہمارا اعتقاد جو ہم اِس دنیاوی زندگی میں رکھتے ہیں جس کے ساتھ ہم بفضلِ توفیقِ باری تعالیٰ اِس عالَمِ گزران سے کوچ کریں گے یہ ہے کہ حضرت سیدنا و مولانا محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم "خاتم النبیین و خیر المرسلین" ہیں جن کے ہاتھ سے اکمالِ دین ہو چکا اور وہ نعمت بمرتبۂ اتمام پہنچ چکی جس کے ذریعہ سے انسان راہِ راست کو اختیار کر کے خدا تک پہنچ سکتا ہے۔" (ازالۂ اوہام)

"جناب سیدنا و مولانا سید الکل و افضل الرسل حضرت خاتم النبیین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک اعلیٰ مقام اور برتر مرتبہ ہے جو اسی ذاتِ کامل الصفات پر ختم ہو گیا ہے جس کی کیفیت کو پہنچنا بھی کسی دوسرے کا کام نہیں چہ جائیکہ وہ

کسی اور کو حاصل ہو سکے"۔ (توضیح مرام)

ختمِ نبوّت کے مسئلہ پر تفصیلی بحث کا یہاں موقع نہیں۔ جو دوست اس بارہ میں جماعتِ احمدیہ کے مسلک سے واقفیت حاصل کرنا چاہیں وہ کسی وقت بھی سلسلہ کے متعلقہ لٹریچر کا مطالعہ فرما کر ذاتی اور یقینی معلومات حاصل فرما سکتے ہیں۔ مگر میں ضمناً یہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ ہم اُس خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں جس کے قبضۂ قدرت میں ہماری جان ہے اور جو ہر چیز پر قادر ہے کہ ہم حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی علیہ السلام کو اس مقام سے ایک ذرّہ بھی زیادہ یا کم نہیں سمجھتے جو مقام حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّت کے آنے والے ہادی مہدی اور مسیح کو دیا ہے۔ ہمارے اور ہمارے دوسرے بھائیوں کے درمیان اِس مسئلہ میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ ایک مہدی اور مسیح کی آمد کے انتظار میں ہیں اور ہمارے نزدیک وہ مہدی اور مسیح آچکا۔ اب ظاہر ہے کہ اگر اس آنے والے کی انتظار سے ختمِ نبوّت کی مُہر نہیں ٹوٹتی تو اس کی آمد پر ایمان لانے سے وہ مُہر کس طرح ٹوٹ سکتی ہے؟ اور اس تمام جھگڑے کا فیصلہ بس اِسی بات پر چکایا جا سکتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ختمِ نبوّت کی آیت کے ہوتے ہوئے بھی آنے والے مسیح کو نبی اللہ کہا اور آپ ختمِ نبوّت کی مُہر توڑنے والے نہ ہوئے تو اُس صادق و امینؐ کے اِس سچّے کلام پر ایمان لانے والا کس طرح

اس مقدس مُہر کو توڑنے والا قرار پایا؟ حیرت ہے اور پھر حیرت ہے....

مگر یہ بحث اِس مضمون سے الگ ہے اور مَیں یہاں ایک محال مفروضہ کے طور پر یہ کہتا ہوں کہ اگر احمدی ختمِ نبوّت کے منکر بھی ہوں (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ) تو کیا اسلام کو یہی ایک خطرہ درپیش ہے اور احمدیوں کے قتل و غارت سے کیا عیسائیت کی یلغار رُک جائے گی؟ اور چہار دانگ عالم میں کیا اسلام کو غلبہ حاصل ہو جائے گا؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی صداقت اور دیانت کے معیار پھر کُل عالم اسلامی میں قائم ہو جائیں گے اور کیا مسلمانوں میں اس کے بعد باہم تمام اختلافات مِٹ جائیں گے اور علماء تکفیر بازی ہمیشہ کے لئے ترک کر دیں گے؟ کیا شیعہ سُنّی پھر بھائی بھائی بن جائیں گے اور بریلویوں اور دیوبندیوں کے جھگڑے قیامت تک کے لئے طے ہو جائیں گے؟....... اور کیا احمدیوں کے قتل و غارت کے بعد ڈاکہ، چوری اور رشوت ستانی کی لعنتیں ہمیشہ کیلئے اسلامی ممالک کو خیر باد کہہ دیں گی؟....... مسجدیں پھر سے آباد ہوں گی اور تہذیبِ نَو کے بداثرات سے سوسائٹی یک دفعہ پاک ہو جائے گی؟ کیا اس کے بعد بیبیوں کے چہرہ سے اُٹھتا ہوا نقاب پھر گرنے لگے گا؟۔ سینما ہال اُجڑ جائیں گے اور رقص و سرود کی محفلیں ویران ہو جائیں گی؟ اور احمدیوں کے تہ تیغ ہونے کے بعد کیا واقعی یورپ اور امریکہ اور افریقہ

اور ایشیا اور آسٹریلیا کی غیر مسلم آبادیاں دیوانہ وار اسلام کی طرف دوڑی چلی آئیں گی؟ ...... کاش ایسا ہو سکتا!!! اور اگر ایسا ہو سکتا تو دنیا دیکھتی کہ کوئی سچّا احمدی بھی اِس راہ میں گردن کٹوانے سے گریز نہ کرتا۔ ہم دوڑتے ہوئے ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہوئے ایسی مقدّس موت کے سمندر میں چھلانگیں لگا دیتے کیونکہ ہماری تو عبادتیں اور ہماری قربانیاں، ہماری زندگی اور ہماری موت محض اس لئے ہے کہ اسلام کو نئی زندگی عطا ہو۔ اگر آج ہماری موت کے ساتھ اسلام کی زندگی وابستہ ہو جائے تو ہم آج اِس وقت اِس لمحہ مرنے کے لئے تیار ہیں۔

بہرحال اِن علماء کا یہ عجیب حال ہے کہ ختمِ نبوّت کا وہ فرضی انکار جو احمدیوں نے کبھی نہیں کیا آج اُن کے لئے اسلام کی زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا ہے اور اسلام کی زندگی اور موت کے وہ اَن گنت مسائل جن سے وہ ہر روز اپنے شہروں، اپنے قصبات اور اپنے دیہات کی گلی گلی میں ہمکنار ہوتے ہیں اُن کی نظر میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے!

اِن کی زود حِسی اور بے حسی کا یہ اجتماعِ ضدّین ایک عجیب تمسخر آمیز صورت اختیار کر لیتا ہے جب ہم انہیں ایک طرف تو پاکستان بننے تک بلکہ بعد میں بھی اِس نظریہ کا قائل پاتے ہیں کہ بس اکھنڈ ہندوستان ہی مسلمان کے مفاد کا ضامن ہو سکتا ہے اور مہاتما گاندھی اور ولبھائی پٹیل

اور پنڈت نہرو کی قیادت میں کانگرس کی صفوں میں "چپ و راست ....

.... چپ و راست"...... کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور دوسری طرف یہ چوہدری محمد ظفر اللہ خاں کی پاکستان کی مرکزی کابینہ میں شمولیت اُن کی آنکھ کا پھوڑا بن جاتی ہے اور اقوامِ متحدہ میں اُن کا پاکستان کی طرف سے نمائندگی کرنا انہیں اسلام کے لئے ایک ہولناک خطرہ نظر آتا ہے۔ علماء کی اس طرزِ فکر پر کبھی ہنسی آتی ہے تو کبھی رونا آتا ہے۔ مقدور ہو تو ایک ایک عالِم کو سامنے بٹھا کر پوچھوں کہ بتاؤ تو سہی کہ گاندھی کی پیروی سے اسلام کس طرح زندہ ہو سکتا تھا اور اب ظفر اللہ کی نمائندگی سے مر کس طرح سکتا ہے؟ کیا اسلام کا اِن امور سے کوئی دُور کا بھی واسطہ ہے؟ ...... اسلام اگر زندہ ہو سکتا ہے تو ہر مسلمان کے سینہ میں شمعِ ایمان کے جلنے سے زندہ ہو سکتا ہے اور مر سکتا ہے تو انہی شمعوں کے بُجھ جانے سے۔ پھر کیا گاندھی کی پیروی سے یہ سب شمعیں ایک ایک کر کے جلنے لگی تھیں اور کیا آج ظفر اللہ کی نمائندگی کے جھونکوں سے معاً یہ شمعیں بُجھنے لگی ہیں؟ کیا ساٹھ کروڑ مسلمانوں کے ایمان کی زندگی اور موت بس انہی دو حادثات پر موقوف تھی یا ہے؟ ....

.... کیا یہ علماء نہیں جانتے کہ اسلام کو پیش آمدہ خطرات کا کسی وزیر کی وزارت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ یہ خطرات محض اُس نازک صورتِ حال

کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے علامہ حالی نہایت درجہ درد کے ساتھ رقمطراز ہیں ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے
اُمّت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے
جس دین کے مدعو تھے کبھی خسرو و کسریٰ
خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے
وہ دین ہوئی بزم جہاں جس سے چراغاں
اب اُس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے
جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہباں
اب اُس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہے
جس دین نے تھے غیروں کے دل آکے ملائے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جُدا ہے

جو دین کہ ہمدرد بنی نوعِ بشر تھا
اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے
جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی
اس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے
جو دین کہ گودوں میں پلا تھا حکماء کی
وہ عرصۂ تیغِ جہلا ہے سفہا ہے
جس دین کی حجت سے سب ادیان تھے مغلوب
اب معترض اس دین پہ ہر ہرزہ درا ہے
ہے دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی
دینداروں میں پر آب ہے باقی نہ صفا ہے
یاں راگ ہے دن رات تو واں رنگ شب و روز
یہ محفلِ اعیاں ہے وہ بزمِ شرفا ہے
چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں
پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے
دولت ہے نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہے
اک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے

(مسدس حالی)

یہ علامہ حالی کی زبان سے مسلمانوں کی زبوں حالی کا اُس وقت کا نقشہ ہے جب ابھی حالت اِس سے بہتر تھی۔ اب تو صورتِ حال اور بھی دِگرگوں ہو چکی ہے اور اقبال کی پیش کردہ تصویر حقیقت سے نسبتاً زیادہ قریب ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے:۔

ہاتھ بے زور ہیں اِلحاد سے دل خوگر ہیں
اُمتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں
بُت شکن اُٹھ گئے باقی جو رہے بُت گر ہیں
تھا براہیم پدر اور پسر آذر ہیں
بادہ آشام نئے بادہ نیا خُم بھی نئے
حرمِ کعبہ نیا بُت بھی نئے تم بھی نئے

کس قدر تم پہ گراں صُبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمہیں پیاری ہے
طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے
تم ہی کہدو یہی آئینِ وفاداری ہے؟

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

جن کو آتا نہیں دُنیا میں کوئی فن تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو
ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے ؟
شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدّن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سیّد بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

مَیں علماء سے پوچھتا ہوں کہ کیا مسلمانوں کی یہ سخت دردناک حالت اِس مقام تک اِسی لئے پہنچی کہ ظفر اللہ خاں نے ایک دن پاکستان کا نمائندہ بننا تھا؟ اور کیا یہ تمام مسلمان جن کا ذکر علّامہ حالیؔ اور علامہ اقبالؔ نے کیا ہے بس اِسی وجہ سے اس خستگی کا شکار ہو گئے کہ ایک قلیل التعداد جماعت پر ”ختم نبوّت“ کے انکار کا الزام لگایا جانا تھا؟

اس وقت علماء کو اسلام کے متعلق جو خطرات نظر آرہے ہیں وہ اگر سچ بھی ہوں تو اُن کی مثال ان حقیقی خطرات کے سامنے جو اُن کو نظر نہیں آرہے ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص ایک حملہ آور ہولناک درندے سے تو آنکھیں بند کرلے اور پیٹھ موڑ کر بیٹھ جائے اور ایک حسین پھول پر بیٹھی ہوئی حسین تتلی کو اپنی جان کا سخت دشمن سمجھ کر سخت خوفزدہ نگاہیں اس پر ڈالے۔ اور کبھی خوف سے پیچھے ہٹ جائے اور کبھی غصہ سے آگے بڑھے تاکہ اُسے اپنی انگلیوں میں مسلے اور پاؤں تلے روند ڈالے۔ یا پھر بعینہٖ اُس شخص کی طرح کہ جسے کمزور پر تو سخت غصہ آتا تھا مگر طاقتور کو دیکھ کر اس کا دل جذباتِ رحم و درد سے بھر جاتا تھا۔ نہ تو یہ آریوں کے خلاف صف آراء ہوتے ہیں نہ عیسائیوں کے خلاف۔ نہ انہیں مشرک یورپ پر غصہ آتا ہے نہ دہریہ روس پر۔ اور اندرونی برائیوں کے کوہ ہائے گراں کو بھی دُور کرنے کی ہمت نہیں پاتے۔ ہاں غصہ آتا ہے تو ان کمزور قلیل التعداد احمدیوں پر جن کا جُرم صرف یہ ہے کہ اُن کے نزدیک حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشگوئی نہایت صفائی اور شان کے ساتھ پوری ہو چکی ہے جس میں ایک مہدی اور ایک مسیح کے آنے کی خوشخبری دی گئی تھی۔ وہی مہدی اور وہی مسیح جس کے ہاتھوں سے آخری زمانہ میں عیسائیت اور دیگر مذاہب پر اسلام کا غلبہ مقدر تھا!

پس ان کو انہی قلیل التعداد احمدیوں پر غصہ آتا ہے جو اسلام کی تبلیغ

کے لیے ساٹھ کروڑ مسلمانوں کا درد اپنے سینوں میں لئے ہوئے دُنیا کے کونے کونے میں حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا قرآن لے کر نکل کھڑے ہوئے ہیں جن کے مقابل پر آج ہر جگہ عیسائیت کے پاؤں اُکھڑتے چلے جا رہے ہیں اور اسلام آگے بڑھ رہا ہے۔ جنہوں نے یورپ کے دل میں بھی مسجدیں بنا دیں اور افریقہ کے تاریک و تار جنگلوں میں بھی کلماتِ تکبیر بلند کئے اور جن کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُن کی کوششوں کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کے فضل سے یہ سیاہ برِّ اعظم اسلام کے نُور سے بڑی تیزی کے ساتھ منوّر ہو رہا ہے۔ کہاں وہ راتیں کہ جب عیسائی پادری یہ سمجھا کرتے تھے کہ چند سالوں کے عرصہ میں وہ سارے افریقہ کو عیسائی بنالیں گے اور کہاں یہ دن کہ آج ایک عیسائی کے بدلہ میں دس افریقن مشرکین اسلام قبول کر رہے ہیں۔

ہاں اسی جُرم کی پاداش میں یہ احمدی اس وقت اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں اور اُن کا علاج بھی وہی ایک علاج ہے جو ہمیشہ سے ایسے مجرموں کا ہوتا چلا آیا ہے یعنی مسائل کو بالائے طاق رکھ دو اور نصیحت کا خیال تک نہ دل میں آنے دو۔ ہاں تلواریں اٹھاؤ اور اُن کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو تہہ تیغ کر دو۔ یہاں تک کہ اُن کا نشان تک دنیا میں باقی نہ رہے یا پھر یہ "منافقت" کی زندگی اختیار کر لیں اور اُن علماء کی ملّت میں لَوٹ جائیں جنکے

ایماء پر ان کا قتلِ عام منایا جا رہا ہو۔

لیکن اِن علماء کی ملّت کونسی ملّت ہے اور یہ اتحاد تا بکے؟ ہم احمدیت سے توبہ کر کے وہ کونسا مذہب اختیار کریں جس سے سب علماء کے دل یکساں ٹھنڈے ہو سکیں۔ کیا حضرت علیؓ کی محبت کا دعویٰ کریں اور ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کو گالیاں دینے لگیں؟ کیا حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عالم الغیب خدا کی طرح عالم الغیب ماننے لگیں اور آپؐ کے جسم عنصری سے انکار کر دیں۔ یا پھر آپؐ کی نورانیت کو یکسر فراموش کر کے بشریت پر بے کار زور دینے لگیں اور مقام کو ایسا گرائیں کہ بڑے بھائی سے زیادہ رتبہ نہ سمجھیں۔ کیا ایسے اہل حدیث ہو جائیں کہ قرآن کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھیں یا ایسے اہل قرآن کہ اپنے آقا کی مقدس احادیث کو یکسر ٹھکرا دیں؟ آخر وہ کونسی ملّتِ واحدہ ہے جس کا فرد بزورِ شمشیر احمدیوں کو بنانا مقصود ہے؟

بعض حقیقی خطرات

گزشتہ صفحات کے مطالعہ کے بعد شاید کوئی یہ خیال کرے کہ علماء کا دین میں تشدّد اور جبر کو جائز قرار دینے کا مسئلہ اور قتلِ مرتد کا مسئلہ یہ دونوں ایسے امور ہیں جن کا ایک چھوٹے سے مسلمان فرقہ سے تعلق ہے اور کیا فرق پڑتا ہے اگر ساٹھ کروڑ کی مسلمان آبادی میں سے چند لاکھ احمدی مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے تہہ تیغ کر دیئے جائیں۔ کم از کم اس کے بعد باقی مسلمان تو امن اور چین کے سانس لیں گے۔ مگر یہ خیال ایک واہمہ سے بڑھ کر حیثیت نہیں رکھتا اور اس زمانہ کے بہت سے علماء کی اُفتادِ طبع نا واقفیت کی دلیل ہے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ ہر طاقتور غیر مسلم کے مقابل پر ان کی قوتِ عمل مفقود ہو جاتی ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دوسرے مسلمان فرقوں

کے خلاف بھی ان کا غصّہ اِس آسانی سے فرو ہو سکتا ہے۔

مَیں یہ نہیں کہتا کہ اُمّت کے تمام علماء ایک ہی طرزِ فکر کے عادی ہیں (خدا وہ وقت نہ لائے!) مگر مشکل یہ ہے کہ شریف غیر جانبدار آواز اکثر کمزور ہوا کرتی ہے اور یہ لوگ ہر بے چین منظر سے پیچھے ہٹ کر اپنا دامن بچا لیتے ہیں۔ پس مَیں اس وقت صرف اُن علماء کی بات کر رہا ہوں جو اکثر فتویٰ بازی کے منظرِ عام پر رہتے ہیں اور تکفیر جن کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے اِن کے افکار اور احساسات اکثر اجتماعِ ضدّین ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو قوّتِ عمل اتنی کمزور پڑ چکی ہوتی ہے کہ جس مشکل میدان میں بھی اسلام کو جہاد کی ضرورت ہو اُس سے کوسوں دُور رہتے ہیں اور جہاں ضرورت نہ ہو وہاں گفتار کے غازی بنکر کُود پڑتے ہیں۔ چنانچہ اِن جہاد کی تعلیم دینے والوں کو آپ جہادِ کشمیر کے وقت سرحدوں کے قریب نہ دیکھیں گے۔ بلکہ بعض اوقات تو جنگ کے دَوران میں اس جہاد کے خلاف فتویٰ دینے کے جُرم میں حکومت کو اِنہیں نظر بند کرنا پڑیگا۔

یہ علماء ہر اُس مسئلہ سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں جس سے اُن کی زود رنج طبیعت سخت برافروختہ ہو سکے اور پھر یہ باہم مسلمان فرقوں کے درمیان افتراق اور مناقشت کو ہوا دے سکیں۔ بُرائیوں کو دیکھنے میں یہ نہایت دُور بین بلکہ سُقم ایجاد نگاہ رکھتے ہیں اور خوبیاں اِن کی نظر سے پہاڑ اوجھل رہتی ہیں۔ اِن

کی ساری بجلیاں صرف مسلمان کا شانوں پر ٹوٹتی ہیں۔ اِن کا اجماع کبھی باہمی محبت کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ کسی تیسرے کا بغض ان کو اکٹھا کرنے کا موجب بنتا ہے۔ چنانچہ کبھی تو آپ "اجماعِ اُمّت" احمدیوں کے خلاف دیکھیں گے اور کبھی شیعوں کے خلاف۔ کبھی بریلویوں کے خلاف یہ اجماع ہو گا اور کبھی دیوبندیوں کے مقابل پر۔ اور کبھی سب مل کر اہل قرآن کے خلاف اجماع کا دلنشین منظر پیش کریں گے۔ ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہتے ہیں کہ ایک باغ کے مالک نے دیکھا کہ ایک سیّد، ایک پٹھان اور ایک میراثی اس کے باغ کا پھل توڑ رہے ہیں اور ان تینوں کے مقابل وہ اپنے آپ کو بہت کمزور پاتا تھا۔ چنانچہ اُس نے آگے بڑھ کر اُنہیں السلام علیکم کہا اور دست بستہ عرض کی کہ قبلہ شاہ صاحب اور محترم خان صاحب آپ دونوں تو خیر معزّز لوگوں میں شمار ہوتے ہیں، بس آپ جو چاہیں کریں کہ آپ ہی کا باغ ہے مگر یہ ...... میراثی کس برتے پر اِس باغ میں آنے کی جرأت کر سکا۔ اس لئے آپ بزرگان اگر میرا ساتھ دیں تو کیوں نہ ہم مل کر پہلے اِس چور کی مرمّت کر لیں پھر آپ مختار ہیں جس طرح چاہیں اور جہاں سے چاہیں اِس باغ کا پھل توڑیں۔ چنانچہ اُن تینوں نے مل کر اُس تنہا میراثی کو پکڑ لیا اور مار مار کر وہیں ڈھیر کر دیا۔ شاہ صاحب اور خان صاحب اس کے معاً بعد پھر پھل کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس پر مالی شاہ صاحب کو الگ لے گیا اور گذارش کی کہ حضرت یہ سب کچھ آپ ہی کا ہے مجھے آپ پر تو

کوئی اعتراض نہیں مگر اِس پٹھان پر بہت غصّہ آ رہا ہے کہ اِس کو تیسری جگہ پر یہ حق کہاں سے مِل گیا کہ میرے باغ کا پھل برباد کرے۔ شاہ صاحب ذرا سیدھے سادے آدمی تھے اُن کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ چنانچہ اُن دونوں نے آخر خان صاحب کو قابو کر ہی لیا اور رسّوں سے باندھ کر بہت مارا اور ادھ مُوا چھوڑ گئے۔ اِس کے بعد اُن دونوں میں سے ایک پھر پھل کی طرف متوجّہ ہوا تو دوسرے نے اُسے کمزور اور تنہا پا کر اُس کی گردن پکڑ لی اور مارتے مارتے نڈھال کر دیا۔

اگر ناظرین ذرا بھی غور کریں تو اُنہیں معلوم ہو جائے گا کہ اِن علماء کی "War Stretegy" یعنی جنگی داؤ پیچ اِس مثال کے بہت مشابہ ہیں۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ اِس باغ کے آپ خود ہی مالک بن بیٹھے ہیں — بہرحال اِس امر میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ یہ تشدّد اور قتلِ مرتد کی آوازیں بلند کرنے والے علماء دل میں مستحکم ارادے لئے بیٹھے ہیں کہ جب بھی اِن کو کسی مخالف فرقہ پر اقتدار حاصل ہو یہ بزور اُس کا صفایا کر دیں گے۔ ختمِ نبوّت کے انکار کے الزام میں احمدیوں کے خلاف ہنگامہ آرائی کے کچھ مناظر آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ اُس وقت یہ علماء یک زبان ہو کر عوام سے کہتے تھے کہ کافر ہیں تو یہی احمدی ہیں اور مرتد ہیں تو یہی اور اُن کے خاتمہ کے ساتھ ہی اسلام کے تمام دُکھوں کا خاتمہ ہو جائے گا اور ہم بھائیوں کی طرح باہم گلے مل کر بیٹھیں گے۔

ہمارے اختلافات اندرونی ہیں اور یہ ایک بیرونی اختلاف ہے۔ ہمارے اختلافات فروعی ہیں اور یہ ایک بنیادی اختلاف ہے۔ مگر اِنہی دنوں کی بات ہے جب یہ تحریک اپنی پوری قوّت کے ساتھ جاری ہو چکی تھی کہ "جماعت اسلامی" کا ترجمان "تسنیم" اہلِ قرآن کے خلاف یہ فتویٰ دیئے بغیر نہ رہ سکا کہ :-

"اگر یہ مشورہ دینے والوں کا مطلب یہ ہے کہ شریعت صرف اتنی ہی ہے جتنی قرآن میں ہے باقی اس کے علاوہ جو کچھ ہے شریعت نہیں ہے تو یہ صریح کُفر ہے اور بالکل اُسی طرح کا کُفر ہے جس طرح کا کُفر قادیانیوں کا ہے بلکہ کچھ اُس سے بھی سخت اور شدید تر ہے!!"

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ابھی ساری توجّہ جماعت احمدیہ پر مرکوز تھی۔ اب تو خیر ہر طرف تکفیر کی گرم بازاری ہے اور ؎

کُفر و ایماں کا جو مقدّمہ تھا
آج پھر اُسی کی رُوبکاری ہے

مذہب کے میدان میں ایک عام ہُلّڑ مچ گیا ہے۔ زید کی لاٹھی ہے تو بکر کا سر۔ عمرو کی داڑھی ہے تو بکر کا ہاتھ، اور ہر ایک کا گریبان ایک دوسرے کے ہاتھوں پارہ پارہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اِس وقت میری نظر کے سامنے ایک کتابچہ ہے جس کا عنوان ہے "دیوبندی مولویوں کا ایمان"۔ یہ (مولانا) عبد المصطفیٰ

ابو یحییٰ محمد معین الدین شافعی قادری رضوی تھانوی نے تصنیف فرمایا ہے۔ اس کے سرورق کے اندرونی صفحہ پر ہی مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کے بارہ میں غیر مبہم الفاظ میں یہ فتویٰ شائع کیا گیا ہے کہ وہ ختمِ نبوّت کے قائل نہ تھے۔ اگرچہ الفاظ ایسے مہذبانہ نہیں مگر مفہوم یہی ہے۔ اس کے بعد کتاب کا اصل مضمون شروع ہوتا ہے اور مولوی اسمٰعیل صاحب دہلوی کو مرکزی حیثیت دے کر تکفیر کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ (عبارت چونکہ نہایت مغلق اور دقیانوسی ہے اس لئے تحریر کے نمونے پیش کرنے سے حتی المقدور احتراز کر رہا ہوں) اس کے بعد دیوبند کے دوسرے ائمہ کے متعلق نام بنام تکفیر کے فتوے ہیں۔ مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری کو بھی بغیر شک کے کافر قرار دیا گیا ہے اور مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کو بھی۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانیٔ دیوبند کے کُفر کی تو بناء ہی مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کی طرح عقیدۂ ختمِ نبوّت کا انکار قرار دی گئی ہے۔

چنانچہ اُن کے کئی ایک اقتباسات درج کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب کلیۃً ختمِ نبوّت کے منکر تھے (حالانکہ جس طرح یہ جھوٹ ہے کہ احمدی ختمِ نبوّت کے قائل نہیں اُسی طرح یہ بھی صریح بہتان ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی ختمِ نبوّت کے منکر تھے) مگر چونکہ ختمِ نبوّت کی تشریح اُن کے نزدیک احمدیوں کی طرح مولانا عبد المصطفٰے ..... شافعی قادری وغیرہم

کی تشریحِ ختمِ نبوّت کے خلاف ہے اس لئے اِس رسالہ کے مصنف عبدالمصطفیٰ جناب مولوی محمد قاسم صاحب کے متعلق فرماتے ہیں :۔

"مسلمانو! دیکھو اس ملعون، ناپاک شیطانی قول نے ختمِ نبوّت کی کیسی جڑ کاٹ دی ہے ...... اب یہ ملاحظہ فرمائیے کہ مولوی قاسم نانوتوی منکرِ ختمِ نبوّت ہے۔ اور منکرینِ ختمِ نبوّت کے حق میں مولوی رشید احمد و مولوی خلیل احمد وغیرہم وہابیہ نے کُفر کے فتوے دیئے ....."

مگر مَیں یہ کہتا ہوں کہ "اب یہ ملاحظہ فرمائیے" کہ وہی ختمِ نبوّت کے انکار کی چُھری جو کبھی ایک عظیم الشّان اجماع کے ساتھ خصوصاً احرار ماہرین فن کے ہاتھوں احمدیوں کے دل پر چلائی جاتی تھی اب کس آزادی سے انہی لوگوں کے دل پر چلنے لگی جو یہ چُھری چلانے میں مشّاق سمجھے جاتے تھے۔ یہ تو محض ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔ افسوس کہ مَیں جگہ کی قلّت کی وجہ سے اس رسالہ کے صفحہ ۱۵ کی وہ عبارت درج نہیں کرسکتا جس کا عنوان ہے :۔

"مرزائیوں قادیانیوں کی طرح دیوبندیوں وہابیوں کے عقیدوں کا مختصر نمونہ"

یہ عبارت بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

اور شورش کاشمیری کی وہ عبارت بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے جو

رسالہ "کافر ساز ملّا" کے سرورق پر درج ہے :-

"جو شخص اکابر دیوبند کے خلاف کُفر کا فتویٰ صادر کرتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ شقی القلب ہے۔ بدبخت ہے۔ بدزبان ہے۔ ذلیل ہے۔ فروتر ہے بلکہ ہم یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ وہ دھوپ چھاؤں کی اولاد ہے"!

اس رسالہ کے صفحہ ۲ کی عبارت بھی خاص طور پر قابلِ توجّہ ہے جس میں شورش کاشمیری صاحب کے "چٹان" ۱۹۶۲ء کے مقالۂ افتتاحیہ کی یہ دھمکی درج ہے کہ :-

"اِن کافرگروں سے ہماری یہ درخواست ضرور ہے کہ اپنی زبانوں کو بند کریں ورنہ ایسا نہ ہو کہ ان کا پوسٹ مارٹم کرنے کی ضرورت محسوس ہو۔ ہم یہ ایک لحظہ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص ان لوگوں کو کافر کہے جو اس ملک میں ایک صدی یا اس سے بھی زائد عرصہ سے اسلام کے صحیح خدمت گذار ہیں۔ ...... کم سے کم مطالبہ یہ ہے کہ حکومت ان کی زبانیں بند کر دے۔ ہمیں اس قسم کے فیض درجت حامی سنت۔ ماحی بدعت شیخ الحدیث اور ابوالفضل کہلانے والے پٹواریوں کی ضرورت نہیں۔ یہ فتنہ پرداز ہیں۔

اور فتنہ رسول اللہ کے ارشاد کے مطابق قتل سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔"

پھر اسی رسالہ کے صفحہ ۹ پر "فی سبیل اللہ فساد" کے زیرِ عنوان شورش کاشمیری صاحب کی ایک نظم درج ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس میں بریلویوں پر "دین فروشی کی روٹیاں" کھانے اور شرعِ پیمبری بیچ کھانے کا الزام لگایا گیا ہے اور لارڈ کلائیو کا خانہ دار قرار دیا گیا ہے۔ پھر آگے چل کر اسی رسالہ میں بریلویوں کو لیگ اور قائدِ اعظم کے دشمن کے طور پر دکھایا گیا ہے۔

اس رسالہ کے علاوہ دیوبندیوں کا شائع کردہ ایک اور دو ورقہ بھی میری نظر سے گزرا ہے جس کا عنوان ہے :-

"رضاخانی فتنہ پردازوں کا سیاہ جھوٹ"

اس میں مدیر "چٹان" آغا شورش کاشمیری کی یہ عبارت درج ہے :-

"ہم نے اِن آنکھوں کے سامنے مولانا محمد علی، مولانا حسین احمد (مدنی) ابوالکلام آزاد، علامہ اقبالؒ، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور اُن کے صفات و کمالات کے دوسرے انسانوں کو بھڑووں اور دیوثوں کی اولاد کے ہاتھوں رُسوا

ہوتے دیکھا ہے۔"

چند سطور کے بعد فرماتے ہیں :۔

"ہم ربّ ذوالجلال کو گواہ بنا کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں گالی دینے والے بھروہ لوگ بھی تھے جو اُن کی بیت الخلاء کی اینٹ سے بھی کمتر درجہ کے لوگ ہیں۔"

اِس کے جواب میں بریلوی رسالہ "شورش کی شورش" کے صفحہ ۳ پر ایک نظم چھپی ہے جس کے چند شعر درج ذیل ہیں :۔

گزری ہے "اُس بازار" ہی میں جس کی زندگی
ہم کو سُنا رہا ہے وہ باتیں "کھری کھری"
ہاتھوں میں لے کے پرچمِ گستاخیٔ رسول
کرنے لگا ہے دہر پہ ظاہر "شناوری"
جھانکا نہ اُس نے اپنے گریبان میں کبھی
آئی نظر نہ اُس کو کبھی اپنی کافری
مَیں پوچھتا ہوں اُس سے کہ اے بانیٔ فساد
کب سے ملی ہے تجھ کو سَنَدِ علمِ دین کی
"پرشاد" مندروں کے بتا کون کھا گیا
ہندو کی مُہر کس کی جبیں پہ بتا لگی

"بھارت کی جے" کے نعرے لگاتا رہا ہے کون
خود سوچ کس نے بیچی ہے شرعِ پیمبری
آزادیٔ وطن کا مخالف بنا تھا کون
بھی کانگرس کے ساتھ بتا کس کی دوستی
نہرو کو "یا رسول" بتا کس نے تھا کہا
روندی تھی کس نے سوچ رسالت کی برتری
نانوتوی پہ کُفر کا فتویٰ لگے نہ کیوں
کیونکر یہ مان لیں کہ مسلماں ہے تھانوی
کس نے کہا ہے "بابِ نبوّت نہیں ہے بند"
کی قادیانیوں کی بتا کس نے رہبری
کس نے سکھائی ہے تجھے توہینِ مصطفٰے
سیکھے ہیں تُو نے کس سے "یہ آدابِ کافری"
ہم "وارثِ سموم و خزاں" ہی سہی مگر
تم سے ملی ہے کون سے پھولوں کو تازگی
ہم فتنہ و فساد کے خُوگر سہی مگر
تم نے تو چھین لی ہے ہزاروں کی زندگی

انسانیت کے نام پہ دیتے ہو گالیاں
اس پر بھی کہہ رہے ہو بُرے ہیں بریلوی
ننگے ہوئے ہو خود ہی شرافت کے نام پر
تہذیب و شرم تم میں ذرا بھی نہیں رہی
پھیلائے فتنے ختمِ نبوّت کی آڑ میں
کرتے ہو نامِ امن پہ تم فتنہ پروری
چندے بٹورتے ہو نبوّت کے نام پر
تم کر رہے ہو نامِ نبی پر گداگری
نعروں سے ہے امیرِ شریعت کوئی بنا
راس آگئی کسی کو "خطابت" کی ساحری

یہ بریلویوں اور دیوبندیوں کی ایک دوسرے کے خلاف دشنام طرازی کا ایک لمبا سلسلہ ہے اور دونوں طرف کی طرزِ کلام طبیعت پر سخت گراں گزرتی ہے مگر ایک بات اسے پڑھنے سے بالکل ظاہر و باہر نظر آتی ہے کہ اکثر علماء کی باہمی تکفیر بازی کی عمارت محض جذباتِ غیظ و غضب پر مبنی ہے۔ جس سمت بھی وہ ان جذبات کا دھارا پھیر دیں وہی فرد یا جماعت یا فرقہ کافر، مرتد، واجب القتل اور مغضوب علیہم بن جاتا ہے۔ چنانچہ وہ تمام الزامات جو ۱۹۵۳ء کے فساد کے دوران میں احمدیوں

پر لگا کر انہیں واجب القتل قرار دیا جاتا تھا ملزمین خود ایک دوسرے پر لگانے لگے۔ احمدیوں کے خلاف بریلویوں اور دیوبندیوں کی طرف سے مشترکہ طور پر یہ الزامات لگا کر عوامی جذبات کو خطرناک حد تک مشتعل کیا جاتا تھا کہ:۔

(۱) احمدی ختمِ نبوّت کے منکر ہیں۔

(۲) احمدی ہتکِ رسولؐ کرتے ہیں۔

(۳) احمدی انگریزوں کے پِٹھو ہیں۔

(۴) احمدی پاکستان کے خلاف ہیں۔

(۵) احمدی جہاد کے خلاف ہیں۔

(۶) احمدی غیر مسلموں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔

(۷) احمدیت مذہب کے نام پر ایک دکانداری ہے۔

اب بعینہٖ یہی الزامات دیوبندی اور بریلوی ایک دوسرے پر لگانے لگے ہیں اور عوام کو پھر انہی ذرائع سے مشتعل کرنے میں مصروف ہیں خصوصاً بعض دیوبندی علماء تو ختمِ نبوّت کے انکار کے الزام میں خطرناک حد تک بریلوی غضب کا نشانہ بنے ہوئے ہیں اور یہ تمام علماء جو کل تک اُمّت کے ایک عظیم الشان اجماع کا دعویٰ لے کر ایک قلیل التعداد جماعت کے پیچھے پڑے ہوئے تھے آج خود اس اجماع کی دھجیاں بکھیر رہے

ہیں۔ ہتھیار بھی وہی ہیں ہتھیار چلانے والے بھی وہی۔ فنونِ جنگ میں بھی کوئی تبدیلی نہیں۔ ہاں بدلا ہے تو ہدف بدل گیا ہے۔ بے اختیار احرار کے متعلق تحقیقاتی عدالت کے ججوں کے وہ الفاظ یاد آجاتے ہیں کہ:۔

"اسلام اُن کے لئے ایک حربہ کی حیثیت رکھتا تھا جسے وہ کسی سیاسی مخالف کو پریشان کرنے کے لئے جب چاہتے بالائے طاق رکھ دیتے اور جب چاہتے اُٹھا لیتے کانگرس کے ساتھ سابقہ پڑنے کی صورت میں تو اُن کے نزدیک مذہب ایک نجی معاملہ تھا اور وہ نظریۂ قومیت کے پابند تھے۔ لیکن جب وہ لیگ کے خلاف صف آراء ہوئے تو اُن کی واحد مصلحت اسلام تھی۔ جس کا اجارہ انہیں خدا کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ اُن کے نزدیک لیگ اسلام سے بے پروا ہی نہ تھی بلکہ دشمنِ اسلام بھی تھی۔ اُن کے نزدیک قائدِ اعظم ایک کافرِ اعظم تھے۔"

یہ الفاظ فاضل ججوں نے احرار کے متعلق استعمال کئے ہیں اور اِن کی صداقت میں کوئی شُبہ نہیں مگر عموماً مذہبی دُنیا میں جب علماء کے احوال پر نظر پڑتی ہے تو وہاں بھی انسان یہ نتیجہ نکالے بغیر نہیں رہ سکتا کہ:۔

"اسلام اُن کے نزدیک ایک حربہ کی حیثیت رکھتا ہے جیسے

وہ کسی مخالف کو پریشان کرنے کے لئے جب چاہتے ہیں بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں اُٹھا لیتے ہیں"

ان علماء کی خلوصِ نیت پر پھر یقین آئے تو کس طرح جبکہ احمدیت کے خلاف بھی وہی حربے استعمال ہوتے ہیں جو بریلویوں کے خلاف، اور بریلویوں کے خلاف بھی وہی حربے استعمال ہوتے ہیں جو دیوبندیوں کے خلاف۔ پھر طرزِ کلام بھی وہی انوکھی طرزِ کلام ہے جس کے اختیار کا تو کیا سوال ذکر تک سے گھن آتی ہے۔ ایک طرف آغا شورش بعض مشہور مذہبی راہنماؤں کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ "دھوپ چھاؤں کی اولاد" ہیں اور دوسری طرف انہیں یہ جواب دیا جاتا ہے کہ:۔

"اگر بریلوی دھوپ چھاؤں کی اولاد ہیں تو تُو اپنے متعلق کیا وثوق سے کہہ سکتا ہے۔ کیا اپنی دفعہ تُو پاس کھڑا تھا؟ کیا معلوم تُو اندھیرے کی اولاد ہو یا۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"[1]

---

[1] "شورش کا آپریشن" بجواب "کافرساز مُلّا" پیش کردہ حافظ محمد حسین حافظ لائل پور صفحہ ۶+

پھر اپنی ایک "نظم" میں کوئی سیّد محمد ایوب تنہاؔ کپورتھلوی شورش صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"احمد رضا کی شان سے تو آشنا کہاں
جا سونگھ ہندوؤں کی لنگوٹی سڑی ہوئی
سکّے ترا رسول ہیں سکّے ترا خدا
بس نے ذرا دکھا دیئے وہ تیری پارٹی
کر کے غلط بیانیاں جھوٹے جہان کے
ہوتا ہے اب ذلیل تو گھر گھر گلی گلی
تُو نے تو دم بھرا ہے سدا کفر کا خبیث
مسلم کے ساتھ کب سے ہُوا ہے تو کھرّی
تکبیر کی خبر تجھے نمرود ہے کہاں
جا ہندوؤں کے ساتھ کہیں کہ ہری ہری
ایوبؔ جی ہے وقت کی قلت بہت یہاں
باتیں دگرنہ اور بھی کرتے کھری کھری"[1]

---

[1] رسالہ "شورش عرف بھاڑے کا ٹٹو" مصنفہ غلام المشائخ جناب شاہ محمد عاشق صوفی مرہٹی و جناب سیّد محمد ایوب تنہا کپورتھلوی صفحہ ۷، ۸ ۔

سید محمد ایوب تنہا صاحب بہت مصروف الاوقات آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر وقت کی قلت نہ ہوتی تو خدا جانے اور کونسی "کھری کھری" باتیں سناتے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سیکرٹری انجمن جماعت اہلسنت مصری شاہ لاہور کے پاس نسبتاً زیادہ وقت ہے کیونکہ نہ صرف یہ کہ انہوں نے دیوبندی علماء خصوصاً شورش صاحب کو دل کھول کر "باتیں کھری کھری" سنائی ہیں بلکہ اپنے مضمون "شورش کی شورش" کو بکثرت ٹھوس حوالہ جات سے مزین کیا ہے اور ہر بات کی دلیل پیش کی ہے۔ چنانچہ ان "کھری کھری" باتوں کے ضمن میں آپ دو دیوبندی علماء کے باہمی اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :-

"...... مولانا حسین احمد صاحب نے مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دیا اور قائداعظم کو کافرِ اعظم کا لقب دیا، اور مولوی حسین احمد کے اسی فتویٰ کی بناء پر مولوی شبیر احمد عثمانی نے کہا تھا کہ :-

"یہ پرلے درجے کی شقاوتِ قلبی ہے کہ قائداعظم کو کافرِ اعظم کہا جائے"۔

شورش صاحب! ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیے کہ

یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کو کافر، ابوجہل، سوٗر، پرلے درجہ کا شقی، احمق اور قائدِاعظم کو کافرِ اعظم کہنے والے کون ہیں؟ علمائے بریلی یا علمائے دیوبند......؟

شورش صاحب! اب بتائیے کہ بقول آپ کے علماءِ سوء۔ کافرگر۔ دین فروش۔ یاوہ گو۔ بے لگام فتنہ گر۔ شقی القلب۔ بدبخت و بدزبان اور دُھوپ چھاؤں کی اولاد علماء بریلی ہیں یا چشمِ بد دُور آپ کے دیوبندی علماء؟"[1]

پھر اگلے صفحہ پر ایک دیوبندی عالم کے ایک فتویٰ سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"بتائیے دیوبندی مذہب اور اس فتویٰ کی رُو سے ساری دُنیا بالخصوص پاکستان میں آپ سمیت کتنے مسلمانوں کا نکاح قائم اور اولاد حلال ہو سکتی ہے؟ علمائے اہلِ سنّت پر تکفیر کا الزام لگانے والو۔

---

[1] "شورش کی شورش" صہ

ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تمہاری
کافر گری و تکفیر بازی کا فتنہ کیسا متعدّی ہے کہ
جس کی رُو سے دنیائے اسلام کا کوئی فرزند مسلمان
و حلال زادہ نہیں ہو سکتا۔"[1]

اور کچھ آگے چل کر مولوی ظفر علی خان صاحب کے کچھ
اشعار نقل کرتے ہیں جن میں احرار کا ذکر اِن الفاظ میں آتا ہے :۔

"گالیاں دے جھوٹ بول احرار کی ٹولی میں مل
نکتہ یوں ہی ہو سکے گا حل سیاسیات کا
خالصہ کا ساتھ دے جب یہ شریعت کا امیر
کیوں نہ کہئے اس کو "باباٹل" سیاسیات کا

پس یہ ایک لمبا اور افسوسناک سلسلۂ سبّ و شتم
ہے جو ایک دوسرے کے خلاف جاری ہے اور تمام الزام حتیٰ کہ
طرزِ کلام بھی وہی ہے جو احمدیّت کے خلاف آج تک اختیار کی
جاتی رہی۔ کیا علماء بتا سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ اس دنیا میں خدا
اور اُس کے رسول کی عظمت کو قائم کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے؟

---

[1] "شورش کی شورش" صہ ۹

معاملہ صرف سب و شتم تک آکر رُک نہیں جاتا اور محض ایک عام اشتعال انگیزی پر ہی اکتفا نہیں بلکہ یہ امر یقینی ہے کہ جب ایک لمبے آرزوؤں کے دور کے بعد ان میں سے کسی گروہِ علماء کو اقتدار نصیب ہوگا تو یہ مخالف فرقوں کے قتلِ عام سے قطعاً گریز نہیں کرینگے۔ جب حصولِ اقتدار سے قبل بھی مذہب کے نام پر قتل، غارت گری اور آگ لگانے کی بکثرت مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں تو پھر کیسے ممکن ہے کہ حصولِ اقتدار کے بعد اس طرزِ عمل میں کوئی فرق آجائے گا۔

جب باہمی نفرت کا یہ عالم ہو، جب اشتعال انگیزی ہر حد سے گزر جائے اور ان شدید جذباتِ غیظ و نفرت پر مستزاد یہ ہو کہ اقتدار بھی حاصل ہو جائے اور تمام ملکی قوتیں اُن کے مدِ مقابل ہونے کی بجائے پسِ پُشت جا کھڑی ہوں تو پھر بھلا کیسے ممکن ہے کہ اس مقامِ فتح و ظفر پر پہنچ کر یہ علماء ظلم و تعدی سے دفعۃً اپنے ہاتھ روک لیں گے۔

ایسے وقت میں ظلم و ستم کی راہ میں صرف ایک ہی روک حائل ہو سکتی ہے کہ ربّ العالمین کے جلال کی ہیبت اُن کے دلوں پر طاری ہو جائے اور تقوی اللہ کا مضبوط ہاتھ اُنہیں اس اقدام

سے باز رکھے۔ لیکن اگر یہ سب کچھ خدا تعالےٰ ہی کی "عظمت اور وقار" کو قائم کرنے کے لئے کیا جا رہا ہو اور تقوی اللہ کا یہی مفہوم اُن کے ذہن میں ہو۔ جب ذاتی رجحاناتِ تشدّد کو مذہبی عقائد ہی کا نام دیا جانے لگا ہو اور جب یہ ساری تعلیم جبر و تشدد خدا ہی کے نام پر اُسی کی طرف منسوب کر کے پیش کی جاتی ہو تو پھر سوائے قادرِ مطلق خدا کے قہری ہاتھ کے کوئی ہاتھ جو ان صاحبِ اقتدار علماء کو اپنے ارادوں کی تکمیل سے باز رکھ سکے۔

اس سلسلہ میں جہاں تک مولانا مودودی کے عقائد کا سوال ہے ان کا ذکر کسی قدر تفصیل سے پہلے گزر چکا ہے۔ رہے باقی علماء تو طوالت کے خوف سے ان کا علیحدہ علیحدہ ذکر تو یہاں ممکن نہیں۔ ہاں اس ضمن میں تحقیقاتی عدالت کے فاضل ججوں کی تحقیق کا ماحصل خود انہی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے :-

"اسلامی مملکت میں ارتداد کی سزا موت ہے۔ اس پر علماء عملاً متفق الرائے ہیں۔ (ملاحظہ ہوں مولانا ابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری صدر جمعیت العلمائے پاکستان

مولانا احمد علی صدر جمعیت العلمائے اسلام مغربی پاکستان۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی بانی و سابق امیر جماعتِ اسلامی

پاکستان - مفتی محمد ادریس جامع اشرفیہ لاہور رکن جمعیۃ العلمائے پاکستان - مولانا داؤد غزنوی صدر جمعیۃ اہل حدیث مغربی پاکستان - مولانا عبد الحلیم قاسمی جمعیۃ العلمائے اسلام پنجاب اور مسٹر ابراہیم علی چشتی کی شہادتیں) اس عقیدے کے مطابق چودھری ظفر اللہ خان نے اگر اپنے موجودہ مذہبی عقائد ورثہ میں حاصل نہیں کئے بلکہ وہ خود اپنی رضامندی سے احمدی ہوئے تھے تو ان کو ہلاک کر دینا چاہیئے۔ اور اگر مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری یا مرزا رضا احمد خاں بریلوی یا ان بے شمار علماء میں سے کوئی صاحب (جو فتوے (EX. D. E. 14) کے خوبصورت درخت کے ہر پتے پر مرقوم دکھائے گئے ہیں۔) ایسی اسلامی مملکت کے رئیس بن جائیں تو یہی انجام دیوبندیوں اور وہابیوں کا ہو گا جن میں مولانا محمد شفیع دیوبندی ممبر بورڈ تعلیمات اسلامی ملحقہ دستور ساز اسمبلی پاکستان اور مولانا داؤد غزنوی بھی شامل ہیں اور اگر مولانا محمد شفیع دیوبندی رئیس مملکت مقرر ہو جائیں تو وہ ان لوگوں کو جنہوں نے دیوبندیوں کو کافر قرار دیا ہے دائرۂ اسلام سے

خارج قرار دیں گے اور اگر وہ لوگ مرتد کی تعریف میں آئیں گے یعنی انہوں نے اپنے مذہبی عقائد ورثے میں حاصل نہ کیئے ہوں گے بلکہ خود اپنا عقیدہ بدل لیا ہوگا۔ تو مفتی صاحب ان کو موت کی سزا دیں گے۔

جب دیوبندیوں کا ایک فتوے (EX. D. E. 13) جس میں اثنا عشری شیعوں کو کافر قرار دیا گیا ہے عدالت میں پیش ہؤا تو کہا گیا کہ یہ اصلی نہیں بلکہ مصنوعی ہے لیکن جب مفتی محمد شفیع نے اس امر کے متعلق دیوبند سے استفسار کیا تو اس دارالعلوم کے دفتر سے اس فتوے کی ایک نقل موصول ہوگئی جس پر دارالعلوم کے تمام اساتذہ کے دستخط ثبت تھے اور ان میں مفتی محمد شفیع صاحب کے دستخط بھی شامل تھے۔ اس فتوے میں لکھا ہے کہ جو لوگ حضرت صدیق اکبرؓ کی صحابیت پر ایمان نہیں رکھتے' جو لوگ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے قاذف ہیں اور جو لوگ قرآن میں تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں وہ کافر ہیں۔ مسٹر ابراہیم علی چشتی نے بھی جنہوں نے مطالعہ کیا ہے اور اپنے مضمون سے باخبر ہیں اس رائے کی

تائید کی ہے۔ ان کے نزدیک شیعہ اپنے اس عقیدہ کی وجہ سے کافر ہیں کہ حضرت علیؓ نبوّت میں ہمارے رسولِ پاکؐ کے شریک تھے۔ مسٹر چشتی نے اس سوال کا جواب دینے سے انکار کیا ہے کہ اگر کوئی سُنّی اپنا عقیدہ بدل کر شیعوں کا ہم خیال ہو جائے تو آیا وہ اس ارتداد کا مرتکب ہوگا جس کی سزا موت ہے۔ شیعوں کے نزدیک تمام سُنّی کافر ہیں اور اہلِ قرآن یعنی وہ لوگ جو حدیث کو غیر معتبر سمجھتے ہیں اور واجب التعمیل نہیں مانتے متّفقہ طور پر کافر ہیں اور یہی حال آزاد منفکرّین کا ہے۔ اس تمام بحث کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ شیعہ، سُنّی، دیوبندی، اہل حدیث اور بریلوی لوگوں میں سے کوئی بھی مسلم نہیں۔ اور اگر مملکت کی حکومت ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہو جو دوسری جماعت کو کافر سمجھتی ہے تو جہاں کوئی شخص ایک عقیدہ کو بدل کر دوسرا اختیار کرے گا اُس کو اسلامی مملکت میں لازماً موت کی سزا دی جائے گی اور جب یہ حقیقت مدِّنظر رکھی جائے کہ ہمارے سامنے مسلم کی

تعریف کے معاملے میں کوئی دو عالم بھی متفق الرائے نہیں ہو سکے تو اِس عقیدے کے نتائج کا قیاس کرنے کے لئے کسی خاص قوتِ متخیلہ کی ضرورت نہیں۔ اگر علماء کی پیش کی ہوئی تعریفوں میں سے ہر تعریف کو معتبر سمجھا جائے، پھر انہیں تحلیل و تحویل کے قاعدے کے ماتحت لایا جائے اور نمونے کے طور پر الزام کی وہ شکل اختیار کی جائے جو گلیلیو کے خلاف انکویزیشن کے فیصلے میں اختیار کی گئی تھی تو اُن وجوہ کی تعداد بے شمار ہو جائے گی جن کی بناء پر کسی شخص کا ارتداد ثابت کیا جا سکے۔" (رپورٹ صفحہ ۲۳۶-۲۳۷)

پس اِن حالات کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اگر اِن مسلمان فرقوں میں سے کسی ایک کے علماء کے ہاتھ میں "اقتدار" آجائے تو باقی تمام فرقوں کے افراد کا قتلِ عام جائز قرار نہیں دیا جائیگا۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا مگر اس فرق کے ساتھ کہ اُس وقت کفر و ارتداد کے فتوے انفرادی طور پر شائع ہونے کی بجائے حکومتِ وقت کے بُلیٹینز (Bulletines) کی صورت میں شائع ہُوا کریں گے یا وزراء کی پریس کانفرنس میں شاید اُن کا اعلان کیا جائے اور یہ تمام فتوے یکطرفہ ہوں گے اور کسی مخالف عقیدہ کے عالم کو یہ حق نہ ہوگا کہ مسلمان حکومت کے کسی عالم کے خلاف فتویٰ جاری کر سکے بلکہ فتویٰ کا کیا سوال

اُس کے لئے تو اپنی جانِ عزیز بچانا بھی ناممکن ہوگا سوائے اِس کے کہ تَقِیَّہ سے کام لے اور

"اگر وہ ایسا ہی راستی پسند ہے کہ منافق بن کر رہنا نہیں چاہتا بلکہ جس چیز پر اب ایمان لایا ہے اُس کی پیروی میں صادق ہونا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو سزائے موت کے لئے کیوں پیش نہیں کرتا؟"

مُبلیٹینز کی سرگرمی کے ساتھ ساتھ گلوٹینز (گردن اُڑانے کا ایک آلہ) کی حرکت بھی تیز تر ہوتی چلی جائیگی اور دھڑا دھڑ سر دھڑ سے جُدا ہونے لگیں گے۔ اور جیسا کہ ہر ایسے تشدّد کے دَور میں ہوا کرتا ہے اُن انتہا پسندوں کے سوا بھی جو منافق بن کر زندہ نہیں رہنا چاہتے اور گیدڑ کی سَو سالہ زندگی پر شیر کی نصف گھنٹہ کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو ارتداد کے الزام میں ماخوذ کئے جائیں گے یعنی وہ لوگ جن کے دشمن انہیں حکومتِ وقت کے ہاتھوں مروانے کے لئے اُن پر کُفر کے الزام لگائینگے (جیسا کہ پہلے بھی لگتے آئے ہیں اور آج بھی لگ رہے ہیں) اور عدالتوں میں کثرت کے ساتھ حلفیہ گواہ پیش ہوا کریں گے کہ فلاں ابنِ فلاں نے بریلوی یا دیوبندی یا مُودُودی عقائد کے خلاف (جس کسی کی بھی حکومت ہو) یہ یہ کُفر بکے تھے۔ چنانچہ ایسے ملزمین کے انکار پر لازماً انہیں پولیس

کی تحویل میں مزید تحقیق کے لئے دے دیا جایا کرے گا اور انہیں طرح طرح کی خوفناک اذیتیں دے کر پوچھا جائے گا کہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر بتاؤ کہ تم نے فلاں کلمۂ کفر کہا تھا یا نہیں۔ پس کچھ تو وہ ہوں گے جو خدا کو حاضر و ناظر جان کر اُس کلمۂ کفر سے انکار کریں گے اور اس "جھوٹ" کی پاداش میں خوفناک اذیتیں سہہ سہہ کر جان دے دیں گے اور کچھ وہ ہوں گے جو اُن ظلموں سے تنگ آکر آخر خدا تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر یہ اقرار کرلیں گے کہ ہاں ہم نے یہ کلمۂ کفر بکا تھا۔ اور اِس "اظہارِ صداقت" کی پاداش میں اُن کی گردنیں شمشیر یا گلوٹین کے ایک وار سے اُڑا دی جائیں گی۔

اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ "اسلامی حکومت" کی اِس عملی تصویر کو دیکھ کر غیر اسلامی دنیا سخت برافروختہ اور متنفر ہوگی۔ اور "اسلام" کے خلاف شدید نفرت کے جذبات سینوں میں بھڑک اُٹھیں گے حتّٰی کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی حسین تعلیم کو جو دراصل سراپا امن اور سلامتی کی تعلیم ہے مجسّم وحشت اور بربریّت کے نام دیئے جانے لگیں گے۔ اور دنیا اس دین سے سخت برگشتہ ہو جائے گی۔ اور وہ افریقہ بھی جو احمدیت کے دلنشین پیغام کو سُن کر اسلام کی طرف تیز قدموں کے ساتھ دوڑا چلا آرہا ہے اپنے قدم روک لے گا بلکہ اُلٹے پاؤں پھر جائے گا اور وہ امریکہ بھی جس کے ہزاروں باشندوں کو احمدیت اسلام کی آغوش میں کھینچ لائی ہے سخت مشکوک

نظروں سے اس مقدس تعلیم کو دیکھنے لگے گا اور یورپ کی بھی وہ تمام ریاستیں جہاں احمدی مبلّغین پانچ وقت نعرہ ہائے توحید بلند کرتے ہیں یک دفعہ اسلام کے نام سے بیزار ہو جائیں گی۔ مگر برسرِ اقتدار علماء کی بلا سے یہ سب کچھ ہوتا رہے، اُن کو تو اسلام کی سربلندی "مرتدین" کے زیرِ زمین ہونے میں ہی نظر آئے گی۔ پس اُن کی بلا سے اگر اسلام کی تبلیغ غیر مذاہب میں رُکتی ہے تو رُکتی پھرے اور اُن کی بلا سے اگر مسلمان بڑھنے کی بجائے کم ہوتے ہیں تو ہوتے رہیں۔ جب تک کروڑوں کروڑ مسلمان ارتداد کے الزام میں قتل نہیں کئے جائیں گے اُن کے نزدیک اسلام فتح یاب اور ظفر مند نہیں ہو سکتا۔

یہ ہے اِس زمانہ کے علمائے اسلام کے نزدیک اسلامی ریاست کا تصوّر اور فتح اسلام کا نقشہ۔ کیا یہی تصوّر نعوذ باللہ ہمارے آقا بانیٔ اسلام حضرت محمّد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کے دل میں بھی تھا؟

مولانا مودودی کے عقب میں کتنے ہیں وہ علماء جو اِس سوال کا یہ جواب دے سکیں کہ:۔

ہاں یہی تھا وہ تصوّر۔ وہ تصوّر یہی تھا۔ یہی تھا.....

............!

اس امکانی جواب کے تصور سے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ آخر کب تک اُمت کے علماء اپنے مقدس و مطہر رسولؐ کی طرف (خدا تعالےٰ کی بے شمار رحمتیں اور درود ہوں اُس کی ذات اور اُس کی آل پر) ظلم و تشدد کے تصورات منسوب کرتے رہیں گے؟ آخر کب تک انصاف کے نام پر ظلم اور امن کے نام پر بد امنی کی تعلیم دی جاتی رہے گی؟ اور کب تک رحمت کے نام پر جور و ستم اور تقدس کے نام پر باپردہ بیبیوں کی بے آبروئی کا درس دیا جاتا رہے گا؟ سبّ و شتم کی غیر اسلامی رسومات آخر کب ترک کی جائیں گی؟ اور کب مخالف فرقوں پر بے بنیاد الزام لگانے کا سلسلہ بند ہو گا؟

یہ راتیں کب ختم ہوں گی اور وہ دن کب آئیں گے جب خدا کی عظمت کو قائم کرنے کے لئے خون کی ہولی نہیں کھیلی جائے گی؟

اور میں سوچتا ہوں کہ کیا اسی طرح سپین کی انکویزیشن کی تاریخ دُہرائی جاتی رہے گی اور مادام توسو کے "ایوان ہائے وحشت" آباد ہوتے رہیں گے؟ ـــــ اور جب میں یہ سوچتا ہوں تو معاً قرآن کریم کی اس آیت کی طرف میرا ذہن منتقل ہو جاتا ہے کہ:-

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝
وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝

النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ (البروج)

مجھے "برجوں والے آسمان اور موعود دن اور شاہد اور مشہود کی قسم ہے کہ کھائیوں والے ہلاک ہو گئے - یعنی کھائیوں میں وہ آگ جلانے والے جس میں خوب ایندھن جھونکا گیا تھا۔"

ہم نے اِس عشق میں کیا کھویا ہے
کیا پایا ہے!!!

سنہ ۱۹۵۳ء کا سُرخ دَور گزر گیا اور کتنے ہی بے کسوں کے خون نے احمدیت میں ایک نیا رنگ بھر دیا اور اُس کی رگوں میں قربانیوں کا تازہ اور پاکیزہ خون دَوڑنے لگا۔ اِس دَور میں احمدیوں کا حال کچھ اسی طرح تھا جس طرح ایک بچہ بھیانک خطرات سے دہشت زدہ ہو کر اپنے بازو کھولے ہوئے ماں کی طرف بے محابا لپکتا ہے۔ پس وہ بھی اپنے رحمٰن ورحیم خدا کی آغوش میں پناہ لینے کے لئے اُس کی طرف دَوڑے اور

سخت گریہ وزاری کے ساتھ اُس کے حضور عاجزانہ دُعاؤں میں لگ گئے۔ بہت سے ایسے کمزور جو کبھی نمازوں میں بھی غفلت کر جاتے تھے اپنے بستروں سے راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر سجدوں میں گرنے لگے اور اپنی سجدہ گاہوں کو خون کے آنسو رو رو کر تر کر دیا یہاں تک کہ آسمان سے اُن پر سکینت نازل ہوئی اور خدا اُن کے دلوں میں اُتر آیا اور ہر آن ان کے ساتھ رہنے لگا۔

پس وہ ہر خطرے سے بے خطر ہو گئے اور ہر خوف اُن کے دلوں سے جاتا رہا۔ انہوں نے وہ سب کچھ پا لیا جس کے حصول کے لئے بنی آدم کو پیدا کیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ وہ تہی دست بھی جن کے گھر لوٹے گئے تھے اور عُمر بھر کے جمع شدہ اثاثے چھینے گئے تھے ایمان و عرفان کی دولت سے مالا مال ہو کر اس سودے پر خوش ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ چند حقیر پیسوں کے بدلہ میں اُنہوں نے وہ دولت پائی ہے جو قارون کے خزانوں کو بھی میسّر نہ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں فقر اور غنا کا جو مقام انہیں نصیب ہوا ہے وہ قیصر و کسریٰ کے مقدّر میں بھی نہ تھا!

اُنہوں نے بخوشی اِس راہ میں جانیں دیں، چھُرے اُن کے سینوں میں گھونپے گئے، اُنہیں آگ میں جلایا گیا، اُنہیں مارا اور پیٹا گیا اور طرح طرح کی جسمانی اذیتیں اُنہیں دی گئیں لیکن وہ اِس راہ میں ثابت قدم رہے

جیسے اُن سے پہلے بھی ہمیشہ وہ لوگ ثابت قدم رہتے آئے ہیں جن کے دل اس ایمان اور یقین سے پُر ہوا کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ وہ حق اور راستی کی راہ میں برداشت کر رہے ہیں۔ جو جانتے ہیں کہ اُن کے دلوں میں بنی نوعِ انسان کی بہبودی کے سوا اور کوئی جذبات نہیں۔ اُن کے اقوال بھی اِس امر کی گواہی دیتے ہیں اور اُن کے افعال بھی۔ اور اُن کی ساری زندگی ہمدردی اور شفقت اور خوش خُلقی اور صبر اور تقوی اللہ کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔

اگرچہ یہ درست ہے کہ اُن میں سے بعض کمزور اِس امتحان کی دشوار گزار راہوں میں آخر تک وفا نہ دکھا سکے اور عشق کے مشکل ترین مقامات پر کچھ یہاں رہ گئے اور کچھ وہاں۔ مگر ایسے کمزوروں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ شاید ہزار یا دس ہزار میں سے ایک۔ مگر اُن کی علیحدگی نقصان کا موجب ہونے کی بجائے جماعت کے لئے مزید تقویت کا موجب ثابت ہوئی اور مزید برکتوں کا پیش خیمہ بنی۔ جماعت کا سوادِ اعظم بہرحال انتہائی صبر اور استقلال کے ساتھ اپنے عہد و پیمان پر قائم رہا۔

اُنہوں نے بخوشی اِس راہ میں جانیں دیں، اور انتہائی صبر کے ساتھ ہر ذلّت کو قبول کیا۔ اُن کے منہ کالے کر کے اُنہیں گلیوں میں پھرایا گیا اور گند اور کیچڑ اُن پر اُچھالے گئے، اُن کے سوانگ بھرے

گئے اور جُوتیوں کے ہار اُن کے گلوں میں ڈالے گئے۔ وہ دُنیا کی ہر مکروہ گالی اور گندے الزام کا نشانہ بن گئے اور خود اپنے محلّوں ہی کی گلیوں میں پھرنا اُن کے لئے دُشوار ہو گیا۔ اُن کے اُن معصوم بچّوں پر بھی آوازے کسے جانے لگے جو نہیں جانتے تھے کہ کس جُرم کی سزا اُنہیں دی جا رہی ہے۔ وہ ہر روز مدرسوں اور بازاروں سے زخمی دل اور آبدیدہ آنکھوں کے ساتھ گھروں کو لوٹتے تھے عجیب غریب اجنبی ناموں سے اُن کو پکارا جاتا تھا اور دوسرے بچّے اپنے ماحول کی تقلید میں اُن پر تالیاں پیٹتے تھے اور "مرزائی کتّا" کی آوازیں جگہ جگہ بلند ہوتی تھیں۔ یہ سب کچھ اُن کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ پس وہ سر پھینکے، دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ، چھوٹے چھوٹے تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے گھروں کی پُر امن چار دیواری کی طرف بڑھتے تھے۔ مگر اُن مختصر صحنوں کی سلامتی بھی بسا اوقات گلی سے پھینکے ہوئے پتھروں سے یک دفعہ جھنجھنا کر ٹوٹ جاتی تھی یا غلاظت کے پلندوں اور قتل کی دھمکیوں پر مشتمل خطوط سے مکدّر ہونے لگتی تھی۔ احمدی ماں باپ نے یہ سب کچھ دیکھا اور اپنے بچّوں کے زخم بھی اپنے سینوں پر کھائے مگر اُن کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔!

آخر یہ حیرت انگیز ماجرا کیوں کر گزرا اور یہ عظیم الشان صبر

کی طاقت اُنہوں نے کہاں سے پائی؟ وہ کون سا مستحکم یقین تھا جو اِن آڑے وقتوں میں اُن کے دلوں کا سہارا بن گیا؟

اگر وہ دروغ گو اور فتنہ پرداز اور جھوٹے اور دجّال تھے۔ اگر احمدیّت ایک دکانداری تھی اور یہ سب سلسلہ انگریز کی غلامی اور دنیا کی لالچ کی خاطر قائم کیا گیا تھا تو اس پیغام کی خاطر دنیا کی ہر لالچ کو اُنہوں نے کیسے ٹھکرا دیا اور اپنے اموال اپنی آنکھوں کے سامنے کیسے لُٹتے دیکھے؟

اپنی جان اور عزت کے لئے ہر خطرہ کیونکر مول لے لیا اور کیوں انہوں نے غیر متزلزل عزم اور صبر کے نمونے دکھائے جن کی توفیق صرف صادق اور راستباز کو عطا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ درحقیقت وہی وجہ تھی جس کا ذکر کرتے ہوئے بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام فرماتے ہیں:-

قوم کے ظلم سے تنگ آ کے مرے پیارے آج
شورِ محشر ترے کوچہ میں مچایا ہم نے

کافر و ملحد و دجّال ہمیں کہتے ہیں
نام کیا کیا غمِ ملّت میں رکھایا ہم نے

تیرے مُنہ کی ہی قسم میرے پیارے احمدؐ
تیری خاطر سے یہ سب بار اٹھایا ہم نے

اور اُن خطرناک دنوں میں بھی ہمارے دل اِس یقین سے پُر تھے کہ آخر ایک دن محبت کو نفرت پر فتح نصیب ہو کر رہے گی ۔ یہ بگڑے ہوئے تیور ضرور بدلیں گے اور یہ رُوٹھے ہوئے بھائی ضرور منیں گے، جذبۂ دل آخر کام کرے گا اور اخلاق کی کشش اُنہیں بہرحال ہمارے سینوں کی طرف کھینچ لائے گی ۔ ہمارے کانوں میں امام جماعت احمدیہ ایدہ اللہ تعالےٰ بنصرہ العزیز کا یہ سکینت بخش پیغام نغمہ ریز تھا اور آج بھی ہے کہ :۔

دشمن کو ظلم کی برچھی سے تم سینہ و دل برمانے دو
یہ درد رہے گا بن کے دُعا ۔ تم صبر کرو وقت آنے دو
جب سونا آگ میں پڑتا ہے تو کُندن بن کے نکلتا ہے
پھر گالیوں سے کیوں ڈرتے ہو دل جلتے ہیں جل جانے دو
تم دیکھوگے کہ اِنہی میں سے قطراتِ محبت ٹپکیں گے
بادل آفاتِ مصائب کے چھاتے ہیں اگر تو چھانے دو

پس آفات و مصائب کے بادل آئے اور چلے گئے۔ اُن کی بجلیاں ہمیں جلا نہ سکیں بلکہ قطراتِ محبّت ٹپکا کر چلی گئیں۔ یہ بادل پھر بھی آتے رہیں گے اور چھاتے رہیں گے مگر ہمیشہ یہ ہمیں اپنی بجلیوں سے بے خوف قطراتِ محبّت کی انتظار میں آنکھیں بچھائے ہوئے پائیں گے۔ اور وہ دن بہت دُور نہیں کہ یہ قطراتِ محبّت ایسے برسیں گے کہ سب کدورتیں دُھل جائیں گی۔ تب رحمت کے آسمانی پانی سے جل تھل بھر جائیں گے۔ اور اس رحمت کے پانی پر خدا کا عرش پھر سے قائم ہوگا! +

(ضیاء الاسلام پریس ربوہ)